آسان عقائد

(عقل، آیاتِ قرآنی اور مستند روایات کی روشنی میں)

جلد دوم
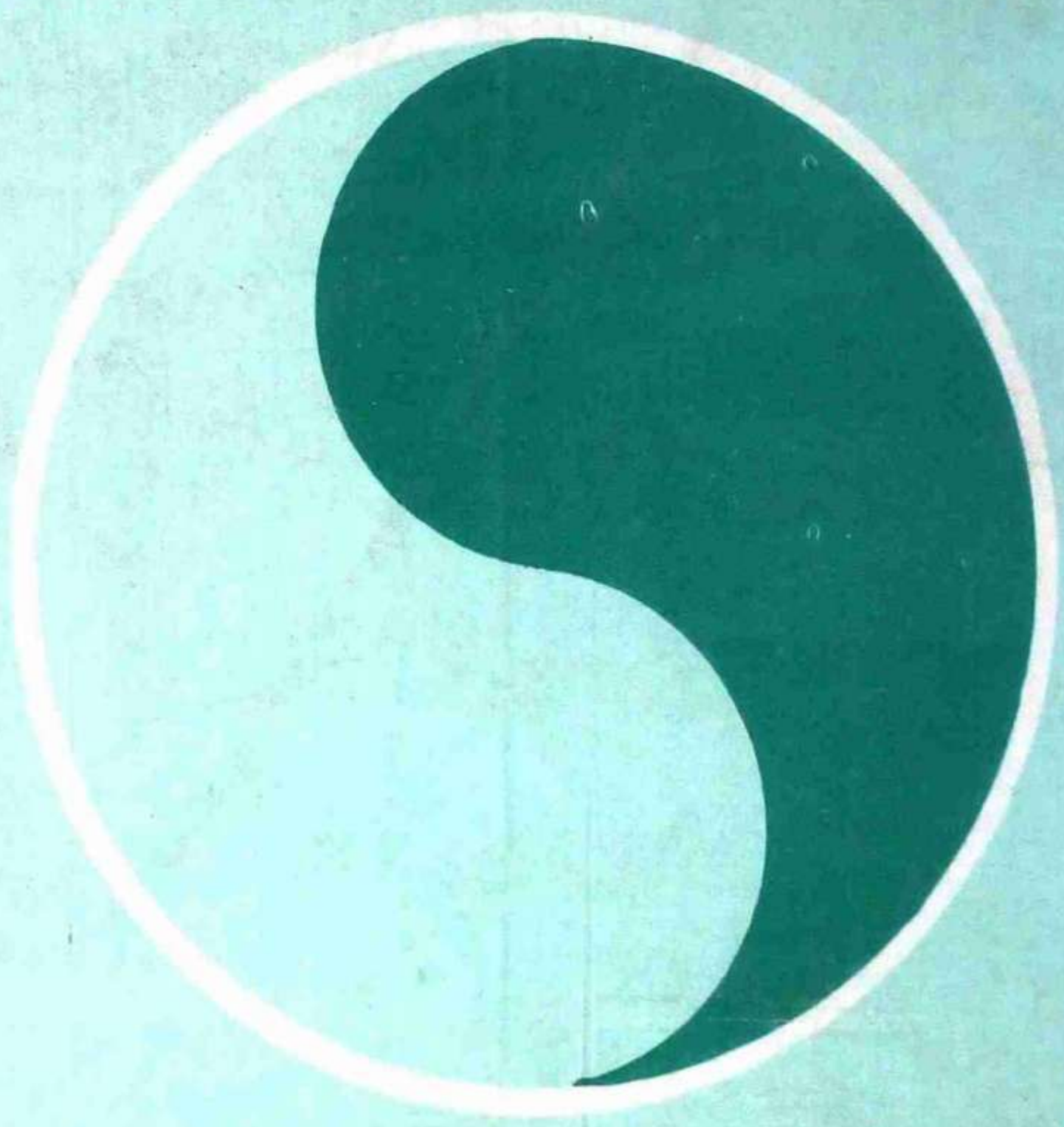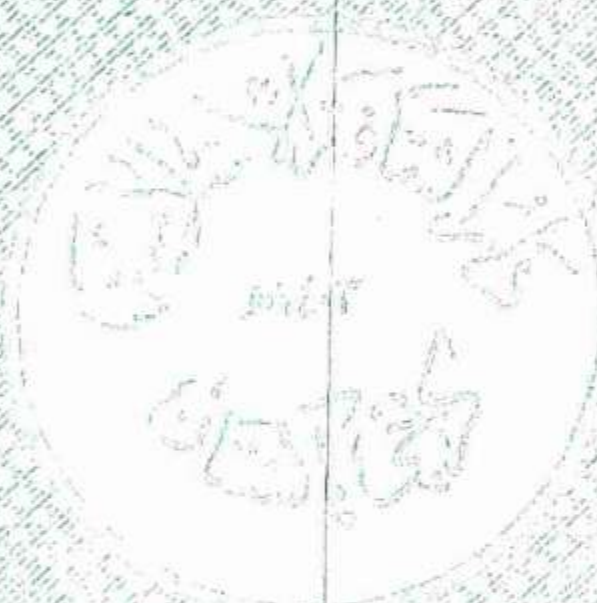
دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

آسان عقائد

(عقل، آیاتِ قرآنی اور مستند روایات کی روشنی میں)

تالیف

مجلس مصنّفین

ترجمہ

حجۃ الاسلام محمد علی فاضل

یکے از مطبوعات

دارُالثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

۲ - جے - ۵/۴ ـــــ ناظم آباد ـــــ نمبر ۲ ـــــ کراچی

نام کتاب : ـــــــــ آسان عقائد (جلد دوم)

تالیف : ـــ مجلس مصنفین ہیئت عقیدتی سیاسی ارتش جمہوری اسلامی ایران

ترجمہ : ـــــــــ حجۃ الاسلام محمد علی فاضل

کتابت : ـــــــــ سید جعفر صادق

تصحیح و تزئین : ـــــــــ سید سعید حیدر زیدی

ناشر : ـــــــــ دارالثقافۃ الاسلامیہ پاکستان

تعاون : ـــــــــ سازمان تبلیغات اسلامی ایران

طبع اول : ـــــــــ صفر المظفر ۱۴۱۰ھ ستمبر ۱۹۸۹ء

تعداد : ـــــــــ ۲۰۰۰
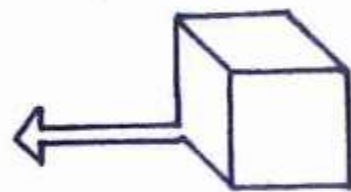
پیش لفظ
صفحہ ۵ تا صفحہ ۶

امامت
صفحہ ۷ تا صفحہ ۱۰۶

امامت عامہ یا ولایتِ فقیہ
(ضمیمہ)
صفحہ ۱۰۷ تا صفحہ ۱۶۲

معاد یا قیامت
صفحہ ۱۶۳ تا صفحہ ۲۳۵
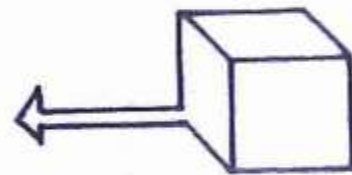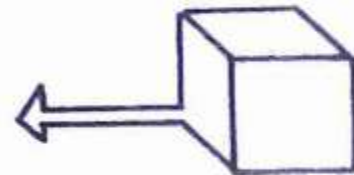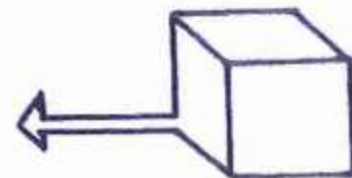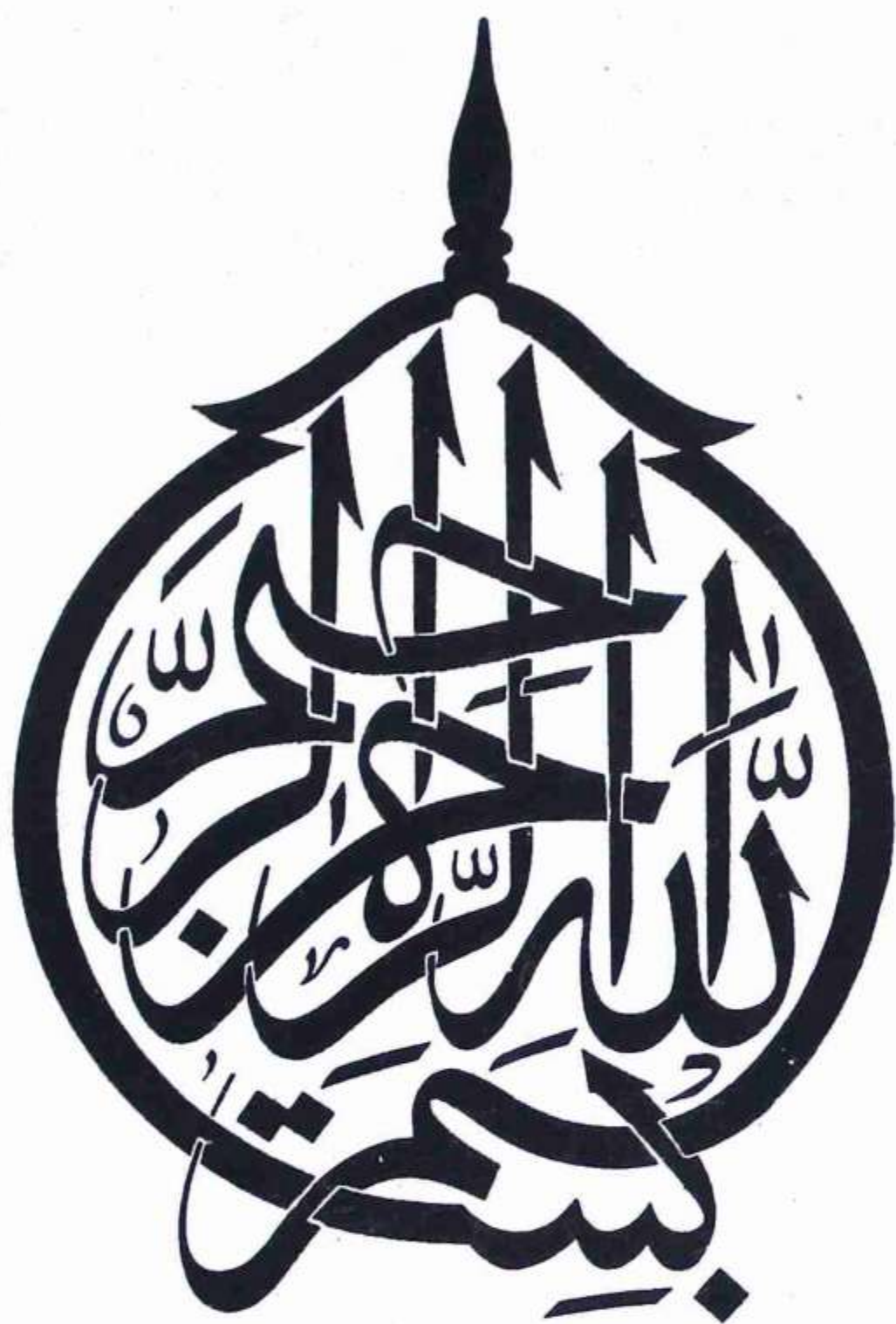
پیش لفظ

نہایت سپاس گزار ہیں اس ربِّ ذوالجلال والاکرام کے جس نے ہمیں ولایتِ ائمۂ معصومینؑ سے سرفراز فرمایا۔

مکتبِ نابِ محمدی، مکتبِ اہلبیتؑ، مکتبِ تشیّع درحقیقت دینِ عقل و فطرت ہے جو فطرت اور عقلِ سلیم انسانی سے ہم آہنگ اور اس کے عین مطابق ہے۔

کتاب ہذا "آسان عقائد" مکتبِ تشیّع کے اسی دعوے اور روش کی ترجمان ہے جس میں اسلامی عقائد کو عقل و فطرت اور قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ کتاب خصوصاً نوجوانوں کے لیے تحریر کی گئی ہے اس لیے اس میں نہایت سادہ بحث اور آسان زبان استعمال کی گئی ہے۔

کتاب کی جلد اوّل میں "توحید" — "عدل" — اور "نبوت" کے موضوعات شامل تھے اور اب جلد "دوم" میں "امامت"

اور" معاد یا قیامت" کے موضوعات شامل ہیں ۔اس کے ساتھ ساتھ زمانۂ غیبتِ امام معصوم میں "حکومتِ اسلامی" اور اسلامی معاشرہ کی قیادت و رہبری اور زعامت و سیادت کے حوالہ سے امامت عامہ یا ولایت فقیہ کو بھی ضمیمہ کے طور پر شامل کیا گیا ہے ۔

ادارہ امید کرتا ہے کہ قارئین گرامی کتاب سے متعلق اپنی قیمتی آراء سے مطلع فرمائیں گے۔

(ناشر)

اِمَامَتْ

فہرست اسباق

پہلا سبق	امامت	۹
دوسرا سبق	وجودِ امام کا فلسفہ	۱۶
تیسرا سبق	امام کی خصوصیات	۲۴
چوتھا سبق	امام کو کون مقرر کرے؟	۳۱
پانچواں سبق	قرآن اور امامت	۴۱
چھٹا سبق	امامت اور سنّتِ رسولؐ	۵۲
ساتواں سبق	حدیث "منزلت" اور "دعوت ذوالعشیرۃ"	۶۳
آٹھواں سبق	حدیث "ثقلین" اور حدیثِ "سفینۂ نوح"	۷۲
نواں سبق	بارہ امام	۸۰
دسواں سبق	حضرت امام مہدیؑ، بارہواں پیشوا اور عظیم عالمی مصلح	۹۰

پہلا سبق

امامت

امامت کی بحث کب سے شروع ہوئی ؟

ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے بعد مسلمان دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئے ۔

ایک گروہ اس بات کا معتقد تھا کہ آنحضرتؐ نے اپنا کوئی جانشین مقرر نہیں کیا بلکہ اپنی جانشینی کا معاملہ مسلمانوں پر چھوڑ دیا کہ وہ خود ہی اس کا انتخاب کرلیں ۔

اس گروہ کو " اہلسنت " کہتے ہیں ۔

دوسرا گروہ اس بات کا معتقد تھا کہ جس طرح پیغمبر معصوم ہیں اسی طرح ان کے جانشین کو بھی ہر قسم کی خطا اور گناہ سے معصوم اور عظیم علم کا مالک

ہونا چاہیے تاکہ وہ لوگوں کی روحانی اور مادی دونوں طرح کی قیادت اور رہبری کرسکے اور اسلام کی بنیادوں کی اچھی طرح حفاظت کرے اور اسے آگے چلائے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس طرح کے شخص کا تقرر صرف خدا ہی کی طرف سے اور اس کے رسولؐ کے ذریعہ ہی ممکن ہوسکتا ہے ۔ اور آپؐ نے یہ کام کیا ہے ۔ اور علی علیہ السلام کا اپنے جانشین کی حیثیت سے تعارف کرایا اور اس کا اعلان کیا ہے۔

اس گروہ کو "امامیہ" یا "شیعہ" کہتے ہیں۔

یہاں پر ہمارا مقصد یہ ہے کہ "مسئلہ امامت" پر عقلی اور تاریخی دلائل، قرآنی آیات اور سنت پیغمبرؐ کی روشنی میں بحث کریں۔

لیکن اصل بحث کو شروع کرنے سے پہلے چند نکات کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری سمجھتے ہیں ۔

۱۔ آیا امامت کی بحث اختلاف پیدا کرتی ہے؟

جوں ہی مسئلہ امامت کی بات شروع ہوتی ہے تو بعض لوگ فوراً کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ زمانہ ایسی باتوں کا نہیں ۔ آج کا دور مسلمانوں کے اتفاق اور اتحاد کا دور ہے اور جانشین پیغمبرؐ کی بات اختلاف کا سبب بنتی ہے ۔ ہمیں مشترک دشمن کا سامنا ہے ۔ ہمیں اس سے مقابلہ کی کوشش کرنی چاہیے لہٰذا اختلافی مسائل کو نہیں چھیڑنا چاہیے بلکہ صیہونیت اور مشرقی اور مغربی سامراج کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

لیکن اس طرح کا طرز فکر یقیناً غلط ہے کیونکہ:

اوّلاً :

جو چیز اختلاف اور انتشار کا سبب بنتی ہے وہ متعصبانہ اور غیر منطقی بحث اور کینہ توزی پر مشتمل لڑائی جھگڑے ہیں۔

لیکن منطقی دلائل پر مبنی بحث مباحثہ جو ہر قسم کے تعصّب اور عناد سے پاک، صحیح دوستانہ ماحول میں انجام پائے نہ صرف اختلاف انگیز ہی نہیں بلکہ موجود باہمی فاصلوں کو کم کرتا اور مشترک نقاط کو تقویت بخشتا ہے۔

خود اہل سنّت چار مذاہب میں تقسیم ہیں۔ حنفی ، حنبلی ، شافعی اور مالکی۔ ان چار مذاہب کا وجود ان کے اختلاف کا سبب نہیں بن سکا۔ اورجب وہ کم ازکم شیعہ فقہ کو پانچویں فقہی مذہب کی حیثیت سے تسلیم کرلیں تو بہت سی مشکلات حل اور بہت سے اختلافات دور ہوسکتے ہیں۔ جیسا کہ ان گزشتہ چند سالوں میں اہلسنت کے مفتیٔ اعظم ، مصر کی الازھر یونیورسٹی کے سربراہ "شیخ شلتوت" نے ایک مؤثر قدم اٹھاکر اختلافات کی خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی ہے اور فقہ شیعہ کی قانونی اور شرعی حیثیت کا اہلسنت کے درمیان اعلان کرکے مسلمانوں کے درمیان باہمی تفاہم کی راہیں ہموار کی ہیں۔

چنانچہ ان کے درمیان اور مرحوم آیۃ اللہ بروجردی، اہل تشیع کے عظیم مرجع کے درمیان دوستانہ مراسم برقرار ہوگئے۔

ثانیاً :

ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام کی صحیح جھلک دوسرے مذاہب کی نسبت مذہب شیعہ میں زیادہ دکھائی دیتی ہے۔

ہم دوسرے تمام اسلامی مذاہب کا احترام کرتے ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ مذہب شیعہ ہی ہے کہ جو اسلام کے تمام پہلوؤں کا صحیح معنوں

میں تعارف کرا سکتا ہے اور اسلامی حکومت سے متعلق مسائل کا حل پیش کر سکتا ہے۔

جب ایسا ہے تو کیوں نہ ہم اپنی اولاد کو دلیل اور منطق کے ذریعے اس مذہب کی تعلیم دیں؟ اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو آنے والی نسلوں کے ساتھ غداری ہوگی۔

ہمارا ایمان اور یقین ہے کہ:

"پیغمبرؐ نے اپنا جانشین مقرر کیا ہے۔"

اور اگر اس نظریہ کو منطق اور استدلال کے ذریعے بحث کا محور قرار دیا جائے تو کیا حرج ہے؟

البتہ اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ کسی کے مذہبی جذبات مجروح نہ ہونے پائیں۔

ثالثاً:

دشمنانِ اسلام نے وحدتِ اسلامی کو پارہ پارہ کرنے اور شیعہ اور سنی کو آپس میں لڑانے کے لیے اس قدر جھوٹ اور افترا پردازیوں سے کام لیا ہے کہ بہت سے ملکوں میں ان کو ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ کر دیا ہے۔

جب ہم مذکورہ طریقے سے مسئلۂ امامت کو پیش کریں گے اور اس بارے میں شیعی عقائد کو بیان کریں گے اور ان کے دلائل کو کتاب اور سنت کی روشنی میں پیش کریں گے تو معلوم ہوگا کہ شیعوں کے بارے میں دشمن کا پروپیگنڈا جھوٹا ہے۔ اور ہمارا (شیعہ سنی کا) مشترک دشمن ہمیشہ ہمیں آپس میں لڑانے کی فکر میں ہے۔

مثال کے طور پر

کچھ عرصہ پہلے سعودی عرب کے جید علماء میں سے ایک

عالمِ دین نے کہا تھا کہ

" میں نے سُنا ہے کہ شیعوں کے پاس وہ قرآن
نہیں ہے جو ہمارے پاس ہے ۔"

غور فرمایا آپ نے ، دشمن کا زہریلا پروپیگنڈا کہاں تک جا پہنچا ہے اور کیا گُل کِھلا رہا ہے ؟

حالانکہ اگر ہمارے اہلسنت بھائی ایران تشریف لائیں اور گھروں اور مسجدوں میں موجود قرآن مجید کے نسخوں کو اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ :

" شیعہ اور سُنی کے قرآن میں کوئی فرق نہیں ہے ۔"

بنابریں جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں امامت کی بحث بھی اسلامی وحدت کو محکم اور پختہ کرنے ، حقائق کے روشن کرنے اور فاصلوں کے کم کرنے میں نہایت ہی مؤثر ثابت ہو گی ۔

۲ - امامت کیا ہے ؟

" امام " جیسا کہ اس عنوان سے ظاہر ہے " مسلمانوں کے پیشوا اور راہبر " کے معنی میں آیا ہے ۔ اور مذہب شیعہ کے اصول عقائد کے مطابق " امام معصوم " اسے کہا جاتا ہے جو تمام امور میں پیغمبرؐ کا جانشین ہو ۔ اس فرق کے ساتھ کہ پیغمبرؐ مذہب کا بانی ہوتا ہے ۔ اور امام اس مذہب کا محافظ اور نگہبان ۔

پیغمبرؐ پر وحی نازل ہوتی ہے

لیکن امامؑ پر نہیں بلکہ وہ پیغمبر سے علم حاصل کرتا ہے جس کے علم کا مقابلہ دنیا کا کوئی دوسرا انسان نہیں کرسکتا ۔

شیعی نکتۂ نظر سے امامِ معصومؑ فقط اسلامی حکومت کا سربراہ اور راہنما ہی نہیں ہوتا بلکہ "مادی" اور "معنوی"، "ظاہری" اور "باطنی" حتیٰ کہ ہر لحاظ سے اسلامی معاشرے کا راہبر اور راہنما بھی ہوتا ہے۔

کسی قسم کی لغزش اور بے راہ روی کے بغیر اسلامی احکام اور عقائد کی حفاظت اس کے ذمہ ہوتی ہے۔ وہ خدا کا برگزیدہ بندہ ہوتا ہے۔

لیکن حضرات اہلسنّت "امامت" کی اس طرح تفسیر نہیں کرتے۔ وہ امام کو صرف اسلامی حکومت کا سربراہ جانتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک ہر دور اور ہر زمانے میں اسلامی حکومت کا سربراہ پیغمبر کا "خلیفہ" اور مسلمانوں کا "امام" ہوتا ہے۔

البتہ ہم آگے چل کر ثابت کریں گے کہ

ہر دور اور زمانے میں روئے زمین پر خدا کے کسی نہ کسی "نمائندہ" کا ہونا ضروری ہے۔

جو یا تو پیغمبر ہو یا معصوم امام۔

تاکہ وہ آئینِ حق کی حفاظت کرے اور حق کے طلبگاروں کو سیدھی راہ کی ہدایت کرے اور اگر بعض وجوہات کی بنا پر کسی دن وہ لوگوں کی نظروں سے غائب ہو بھی جائے تو اس کی طرف سے کچھ ایسے لوگ موجود ہوں جو اس کی نمائندگی میں احکام خدا کی تبلیغ اور اسلامی حکومت کی تشکیل کا بیڑا اٹھائیں۔

؟ سوالات

① جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ موجودہ دور میں امامت کی بحث نہیں کرنی چاہیئے۔ ان کی دلیل کیا ہے ؟

② اس نظریے کو رَدّ کرنے کے لیے آپ کے پاس کیا مدلل جواب ہے ؟

③ دشمنانِ اسلام نے مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈالنے کے کیا ذرائع استعمال کیے ہیں ؟ اور اس خلیج کو پاٹنے کی کیا صورت ہے ؟

④ دشمنان اسلام کے مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈالنے کے مختلف نمونے آپ کو یاد ہیں ؟

⑤ مذہب شیعہ میں " امامت " کا کیا تصور ہے ؟ اور مذہب سُنّی میں " امامت " کس چیز کا نام ہے ؟ دونوں کا آپس میں فرق بیان کریں ۔ ؟

دوسرا سبق

وجودِ امامؑ کا فلسفہ

انبیاء کی بعثت کے بارے میں جو بحث ہو چکی ہے وہ بڑی حد تک ہمیں پیغمبرؐ کے بعد امامؑ کے وجود کی ضرورت سے آگاہ کرتی ہے کیونکہ پیغمبر اور امام کا بڑی حد تک آپس میں ملتا جلتا پروگرام ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں پر کچھ اور مسائل پر روشنی ڈالیں گے۔

۱۔ معنوی کمال

ہر چیز سے پہلے ہم انسان کی پیدائش کے فلسفے کو بیان کریں گے جو تخلیق کائنات کا ایک عظیم شاہکار ہے۔

انسان کو اپنے خالق، کمال مطلق اور معنوی کمال تک پہنچنے کے لیے بڑے طولانی راستوں اور کئی نشیب و فراز سے گزرنا پڑتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کا راستہ ایک معصوم پیشوا کی راہنمائی اور راہبری کے بغیر طے نہیں کیا جا سکتا اور ایک آسمانی معلّم کی ہدایت کے بغیر منزل مقصود تک ہرگز نہیں پہنچا جا سکتا۔

"کیونکہ ہر طرف تاریکیاں ہیں اور گمراہ ہونے کے خطرات۔"

یہ ٹھیک ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انسان کو عقل و خرد جیسی نعمت سے نوازا ہے، قوی اور حساس ضمیر اسے دیا ہے، آسمانی کتابیں اس کے لیے نازل کی ہیں۔ اس کے باوجود پھر بھی اس بات کا امکان موجود ہے کہ وہ راستے کا انتخاب کرنے میں غلط فہمی کا شکار ہو جائے۔

یقیناً ایک معصوم پیشوا کا وجود بے راہ روی اور گمراہی سے بچنے کے لیے بڑی حد تک مؤثر ہے اور گمراہی کے خطرات کو کافی حد تک کم کرتا ہے

اسی بنا پر

"امامؑ کا وجود انسان کے ہدفِ خلقت کی تکمیل کرتا ہے۔"

اور یہی وہ چیز ہے جسے "کلام" یا "عقائد" کی کتابوں میں "قاعدۂ لطف" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اور "قاعدۂ لطف" سے مراد یہ ہے کہ انسان کو درجۂ کمال اور مقصدِ تخلیق تک پہنچنے کے لیے جن ذرائع کی ضرورت ہے خداوند حکیم و خبیر یہ ذرائع اس کے اختیار میں دیتا ہے۔

منجملہ ان ذرائع کے انبیاء کا مبعوث کرنا اور معصوم امام کا منصوب کرنا ہے۔

۲۔ آسمانی شریعت کی حفاظت

یقیناً آپ جانتے ہوں گے کہ جب ادیانِ الٰہی انبیاء کے مقدس قلوب

پر نازل ہوتے ہیں تو بارش کے قطرے کی مانند بالکل صاف و شفاف، زندگی بخش اور حیات پرور ہوتے ہیں۔

لیکن جب گندگی سے آلودہ ماحول اور ناتوان یا ناپاک ذہنوں میں پہنچتے ہیں تو آہستہ آہستہ آلودہ ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ خرافات اور موہومات کا ان میں اضافہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

آخر ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے کہ ان میں روزِ اول کی صفائی اور شفافیت باقی نہیں رہتی اور ایسی صورت میں نہ تو وہ کشش باقی رہ جاتی ہے اور نہ ہی تربیت کے لیے چنداں تاثیر۔

ایک تو ہدایت کے پیاسوں کو سیرابی کی صلاحیت کھو دیتے ہیں دوسرے نہ ہی فضیلت کے پھولوں کو قلوب انسانی میں شگوفہ کر سکتے ہیں۔

بنا بریں ہمیشہ ایک معصوم پیشوا کا ہونا ضروری ہے جو دین کی صحیح معنوں میں حفاظت کر سکے اور دین کو کجی اور لغزشوں سے بچائے رکھے۔ اور دین میں ایسے افکار کو داخل ہونے سے روکے جو غلط، ناروا اور صحیح نہ ہوں۔ موہومات اور خرافات کو دینی اقدار میں تبدیل ہو جانے سے بچائے۔

اگر دین اور مذہب کی حفاظت کے لیے اس قسم کا پیشوا موجود نہ ہو تو بہت کم مدت میں دین کی اصل حقیقت ختم ہو کر رہ جائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ امیر المومنین علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں:

"اَللّٰھُمَّ بَلٰی، لَا تَخْلُو الْاَرْضُ مِنْ
قَائِمٍ لِلّٰہِ بِحُجَّۃٍ، اِمَّا ظَاھِرًا

مَشْهُوراً وَاِمَّا خَائِفًا مَغْمُوراً لِئَلَّا تَبْطُلَ حُجَجُ اللّٰهِ وَ بَيِّنَاتُهُ" (نہج البلاغہ کلمات قصار۔ جملہ ۱۴۷)

" ہرگز زمین وجود حجت خدا سے خالی نہیں رہ سکتی خواہ یہ حجت ظاہر اور آشکار صورت میں ہو یا خوف کی حالت میں مخفی اور پوشیدہ۔ تاکہ خدا کی دلیلیں اور روشن نشانیاں مٹ نہ جائیں۔"

درحقیقت امامؑ کا دل اس محفوظ صندوق کی مانند ہوتا ہے جس میں قیمتی ریکارڈ رکھا ہوتا ہے تاکہ وہ چوروں کے ہاتھ لگنے یا دوسرے حوادث کی گزند سے بالکل محفوظ رہ سکے۔

اور یہ خود، وجود امامؑ کا ایک اور فلسفہ ہے۔

۳۔ امت کی سیاسی اور اجتماعی قیادت

اس میں شک نہیں کہ کوئی بھی معاشرہ ایسے اجتماعی نظام کے بغیر زندہ و سلامت نہیں رہ سکتا جس کی قیادت کسی طاقتور اور مضبوط قائد کے ہاتھ میں نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ قدیم الایام سے دنیا کی تمام اقوام اپنے لیے راہبر کا انتخاب کرتی آرہی ہیں۔ جو کچھ تو صحیح اور صالح افراد ہوتے تھے اور کچھ غلط اور غیر صالح۔

اور کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ عوام کو راہبری کی ضرورت کے پیش نظر ظالم اور جابر بادشاہ "عوامی راہبر" کے روپ میں ان پر مختلف حیلوں بہانوں سے مسلّط ہو جاتے تھے اور ان کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لیتے تھے .....

یہ تو ہوا ایک پہلو۔

ادھر چونکہ انسان کو معنوی کمال کو حاصل کرنا ہے لہٰذا اسے اس راہ کو تنہا نہیں بلکہ پورے معاشرہ کے ساتھ طے کرنا ہوگا۔

کیونکہ فکری، جسمانی، مادی اور روحانی لحاظ سے، فرد کی طاقت ناچیز اور اجتماعی طاقت بہت کچھ ہوا کرتی ہے۔

اور یہ اجتماعی طاقت ایسے معاشرے میں حاصل ہو سکتی ہے جس پر صحیح نظام حکم فرما ہو جو انسانی استعدادوں کو پروان چڑھنے کے مواقع فراہم کرے۔ بے راہ روی اور لغزشوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرے، ہر ایک فرد کے حقوق کی حفاظت کرے۔ عظیم مقاصد تک پہنچنے کے لیے منصوبہ سازی کرے اور لوگوں کو بنیادی حقوق کی آزادی فراہم کرے۔

چونکہ خطاکار اور گنہگار انسان مذکورہ پروگرام کو صحیح معنوں میں عملی جامہ پہنانے اور مذکورہ فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا جیسا کہ ہر روز ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا کے سیاستدان ایسی لغزشوں کا شکار ہو کر سیدھے راستے سے ہٹ جاتے ہیں جن کی تلافی بڑی حد تک ناممکن ہوتی ہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ

خداوند عالم کی طرف سے ایک ایسا پیشوا ہو جو ہر قسم کی غلطیوں سے پاک اور گناہوں سے معصوم ہو اور معاشرے کو صحیح سمت پر چلائے۔ عوامی طاقت اور مفکرین کے صحیح افکار کے ذریعہ بے راہ روی اور لغزشوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرے۔

اور یہ " قاعدہ لطف " کے شعبوں میں ایک اور شعبہ ہے ۔

البتہ اس بات کا ذکر بھی کرتے چلیں کہ ایسے زمانے میں جبکہ امامِ معصومؑ مختلف وجوہات کی بنا پر غائب ہوں تو ایسے دور کے لیے لوگوں کے فرائض کو مفصل بیان کیا گیا ہے جس کی تفصیل آگے چل کر " ولایتِ فقیہ " کی بحث میں بیان کی جائے گی۔

۴ - اتمامِ حجت

امامؑ کے وجود سے نہ صرف وہ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جن کے دل ہدایت اور راہنمائی کے لیے آمادہ ہوتے ہیں اور کمال مطلق کی راہ کو طے کرتے ہیں بلکہ اس سے ان لوگوں پر بھی حجت تمام ہو جاتی ہے جو جان بوجھ کر غلط راستہ اختیار کرتے ہیں تاکہ سزا کی جو وعید انھیں دی گئی ہے وہ بھی بلاوجہ نہ ہو۔ اور کل کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اگر خدا کی طرف سے مقرر کردہ راہبر ہماری راہنمائی کرتا تو ہم کبھی غلط راستہ اختیار نہ کرتے ۔

الغرض، عذر کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے ۔ حق کے دلائل کافی حد تک بیان ہو جائیں ۔ ناآگاہ اور بے خبر لوگوں کو آگاہی مل جائے ۔ اور باخبر افراد پورے اطمینان اور دل جمعی کے ساتھ اپنے راستے کو طے کرتے رہیں۔

۵ - امامؑ، قدرت کے فیض کا عظیم واسطہ ہے

بہت سے علماء اور دانشمندوں نے اسلامی احادیث کی روشنی میں پیغمبر اور امامؑ کے وجود کو عالمِ انسانیت بلکہ پوری کائنات میں انسانی

جسم میں "دل" کی موجودگی سے تشبیہ دی ہے۔

اور ہر ایک جانتا ہے کہ جب دل دھڑکتا ہے تو وہ خون کو بدن کی تمام رگوں میں بھیجتا ہے۔ اور بدن کے تمام خلیوں کو غذا بہم پہنچاتا ہے اور امام معصوم ایک انسانِ کامل اور قافلۂ انسانیت کے سالارِ کارواں کی حیثیت سے خدائی فیض کے نازل ہونے کا سبب بنتا ہے۔

اور جو شخص پیغمبر یا امام سے جتنا نزدیک ہوتا ہے اتنا ہی وہ فیضانِ الٰہی سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے۔

لہٰذا جس طرح انسانی جسم کے لیے دل کا وجود ضروری ہے اسی طرح کائنات کے جسم کے لیے خدائی فیض کے اس "ذریعہ" کا ہونا بھی لازمی ہے۔

البتہ پیغمبر ہو یا امام، اپنی طرف سے کسی کو کوئی چیز نہیں دیتے بلکہ جو کچھ بھی وہ کسی کو دیتے ہیں وہ سب خدا کی جانب سے ہوتا ہے۔ لیکن جیسا کہ "دل" بدن کے لیے فیضِ الٰہی کا ایک ذریعہ ہوتا ہے اسی طرح پیغمبر اور امام بھی عالمِ انسانیت کے ہر فرد کے لیے فیضانِ الٰہی کا وسیلہ ہوتے ہیں۔

سوالات ؟

(۱) انسان کو کمال تک پہنچانے کے لیے امام علیہ السلام کا کیا کردار ہوتا ہے ؟

(۲) شریعت کی نگہبانی کے لیے امامؑ کیا کردار ادا کرتا ہے ؟

(۳) — حکومت کی راہبری اور اجتماعی نظام کو چلانے کے لیے امام علیہ السلام کا کیا کردار ہوتا ہے ؟

(۴) — اتمامِ حجت کا کیا معنی ہے ؟ اور اس سلسلے میں امامؑ کا کیا کردار ہوتا ہے ؟

(۵) — فیض کا ذریعہ کیا ہوتا ہے ؟ اور امام اور نبی کو اس بارے میں کس چیز سے تشبیہ دی جاسکتی ہے ؟

تیسرا سبق

امام کی خصوصیات

اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے ایک نکتہ کی جانب توجہ مبذول کرانی ضروری ہے اور وہ یہ :

قرآن کی رُو سے "امامؑ کا مقام" سب سے اعلیٰ ہے اور جس شخص کو یہ عہدہ ملتا ہے اس کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔

حتیٰ کہ امامت کا درجہ "نبوت" و "رسالت" سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیمؑ بت شکن کی داستان میں قرآن نے ہمیں بتایا ہے :

وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ
فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ

لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ
قَالَ لَا یَنَالُ عَہْدِی الظّٰلِمِیْنَ ۔"

(سورۂ بقرہ آیت ...)

"خداوند عالم نے ابراہیم علیہ السلام کی چند اہم امور میں آزمائش کی اور وہ ان میں کامیاب ہو گئے۔ خدا نے انھیں فرمایا۔ میں تمھیں لوگوں کی امامت کے لیے منصوب کرتا ہوں۔ ابراہیمؑ نے کہا: میری اولاد (بھی اس مقام کو پائے گی) خدا نے فرمایا (ایسا ہو گا لیکن) امامت کا عہدہ ظالموں کو نہیں ملے گا (اور جو لوگ شرک یا گناہ سے آلودہ ہوں ان کو ایسا عہدہ ملنا ناممکن ہے)"

اس لحاظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نبوت اور رسالت کے مراحل سے گزرتے اور مختلف امتحانوں میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد لوگوں کی مادی اور روحانی، ظاہری اور باطنی امور میں امامت اور پیشوائی کے عظیم مرتبے پر فائز ہوئے۔

اسلام کے عظیم الشان پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی نبوت اور رسالت کے عہدے پر فائز ہونے کے علاوہ امامت کے درجے پر بھی فائز تھے۔ اسی طرح اور بھی بہت سے انبیاء کرام اپنی اپنی امتوں کے امام تھے۔

ہر مرتبے اور مقام کے لیے شرائط اور صفات، فرائض اور ذمہ داریوں کے مطابق ہوتے ہیں۔

یعنی جس قدر کسی کا مقام اور مرتبہ بلند ہو گا اور ذمہ داریاں

سنگین ہوں گی اسی قدر اس کے لیے شرائط اور صفات بھی سخت اور سنگین ہوں گی۔

مثلاً اسلام میں قضاوت، گواہی یا نماز کی جماعت کے لیے عدالت کی شرط ضروری ہے۔ جہاں ایک گواہی دینے کے لیے یا نماز باجماعت پڑھانے کے لیے عدالت کی شرط ضروری ہے وہاں آپ خود ہی اندازہ لگائیں کہ پوری امت کی امامت اور پیشوائی جیسے عظیم مرتبے کے لیے کس قدر سنگین شرائط ہوں گی۔

امامؑ کے لیے چند معتبر شرائط:

۱۔ گناہوں سے معصوم ہونا

امامؑ کے لیے ضروری ہے کہ پیغمبر کی مانند عصمت کا مالک بھی ہو۔ یعنی ہر قسم کی غلطی اور گناہ سے محفوظ ہو۔ وگرنہ وہ دوسروں کے لیے نہ تو رہبر بن سکتا ہے اور نہ ہی اسوہ اور نمونہ۔ اور نیز لوگوں کا اس پر اعتماد بھی قائم نہیں ہوسکے گا۔

امامؑ کی لوگوں کے دل و جان پر حکومت ہونی چاہیئے۔ اس کا ہر فرمان کسی قسم کی چون و چرا کے بغیر مان لیا جانا چاہیئے۔ لہٰذا جو شخص گناہوں سے آلودہ ہو وہ اس قسم کی مقبولیت ہرگز حاصل نہیں کرسکتا۔ اور نہ ہی ہر طرح سے اس پر اعتماد اور اطمینان کیا جاسکتا ہے۔

جو شخص اپنے روزمرہ کے کاموں میں غلطی کا ارتکاب کرتا ہے معاشرے کے کاموں میں اس کے نکتہ ہائے نظر پر کس طرح اعتماد کیا جاسکتا ہے؟ اور کس طرح بے چون و چرا اس کی اطاعت کی جاسکتی ہے؟

۲- عالم ہونا

پیغمبرؐ کی طرح امامؑ بھی لوگوں کے لیے علم کی پناہ گاہ ہوتا ہے ۔ لہٰذا وہ دین کے اصول و فروع ، قرآن کے ظاہر اور باطن ، سنت کے تمام طریقوں غرضیکہ تعلیماتِ اسلامی سے مکمل آگاہی رکھتا ہو ۔

کیونکہ وہ ایک طرف تو شریعت کا محافظ اور نگراں ہوتا ہے ، دوسری طرف امت کا راہبر اور راہنما بھی ہوتا ہے ۔

جو لوگ پیچیدہ مسائل کے وقت تشویش کا شکار ہو جاتے ہیں یا دوسروں سے مسائل کا حل دریافت کرتے ہیں وہ معاشرے کی علمی ضروریات کو پورا کرنے میں ناکام ہوتے ہیں اور وہ کسی بھی صورت میں امت اسلامی کی امامت پیشوائی اور رہبری کی صلاحیت نہیں رکھتے ۔

خلاصۂ کلام یہ کہ

امام کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ تمام دنیا سے زیادہ عالم ، دین خدا سے پوری طرح باخبر ہو اور پیغمبر کی رحلت کے بعد خلا کو پورا کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتا ہو اور اسلام کو اس کے اصلی خطوط پر چلا سکتا ہو ۔

۳- شجاعت

امام کو اسلامی معاشرے کا شجاع ترین فرد ہونا چاہیے کیونکہ شجاعت کے بغیر اسلامی قیادت ناممکن ہے ۔ سخت اور ناگوار حالات میں شجاعت ، طاقتوروں ، ستمگاروں اور ظالموں کے مقابلے میں شجاعت ، اور داخلی اور خارجی دشمنوں کے مقابلے میں شجاعت ۔

۴۔ زھد و تقویٰ

سب جانتے ہیں کہ جو لوگ زرق و برق دنیا کے اسیر ہوتے ہیں وہ جلدی دھوکے میں آجاتے ہیں۔ حق اور عدالت کی راہ سے بہت جلد بھٹک جانا ان کے لیے بہت آسان ہوتا ہے۔

کبھی لالچ اور طمع کے ذریعے اور کبھی دھمکیوں اور ڈرانے کے ذریعے دنیا کے ان بندوں کو اپنے صحیح راستے سے ہٹایا جا سکتا ہے۔

اس دنیا کے زرق برق اور ٹھاٹھ باٹھ کے سامنے امام کو "امیر" ہونا چاہیے نہ کہ "اسیر"۔

وہ اس مادی دنیا کی قید و بند سے مکمل آزاد اور بے نیاز ہو۔ خواہشات نفسانی کی قید، عہدے اور مرتبے کی قید، مال اور ثروت کی قید سے پوری طرح آزاد ہو، تاکہ نہ تو اسے فریب دیا جا سکے اور نہ ہی ڈرا دھمکا کر اسے کسی قسم کی سودے بازی پر مجبور کیا جا سکے۔

۵۔ اخلاقی کشش

پیغمبرِ اسلامؐ کے بارے میں قرآن کہتا ہے :

"فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ
وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ
لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ۔"

(سورہ آل عمران آیت ۱۵۹)

"خدا کی رحمت کی وجہ سے (اے پیغمبرؐ) آپ نرم خو
تھے اور اگر سخت اور سنگدل ہوتے تو لوگ
آپؐ سے دور ہو جاتے۔"

نہ صرف پیغمبرؐ بلکہ امامؑ اور معاشرے کے ہر لیڈر کے لیے حسن اخلاق اور پرکشش طبیعت کا ہونا ضروری ہے۔ تاکہ وہ مقناطیس کی مانند لوگوں کو اپنی طرف کھینچ سکے۔

ہر ایسی سخت گیری اور بداخلاقی جس سے لوگ منتشر اور متنفر ہو جائیں یقیناً امام اور نبی کے لیے بہت بڑا عیب ہے اور نبی و امام اس طرح کے عیب سے بالکل پاک ہیں۔

یہ ہیں وہ چند اہم شرائط جنھیں بزرگ علماء نے امامؑ کی ذات کے لیے ضروری بتایا ہے۔

البتہ مذکورہ صفات کے علاوہ اور بھی کچھ صفات ہیں جن کا امامؑ کی ذات میں پایا جانا ضروری ہوتا ہے۔

سوالات

(۱) امامت کا مرتبہ دوسرے تمام مراتب سے کیونکر بلند ہوتا ہے؟

(۲) آیا آنحضرتؐ اور دوسرے اولوالعزم نبی بھی

امام تھے ؟

(۳) —— اگر امام معصوم نہ ہو تو کیا مشکل پیش آئے گی ؟

(۴) —— امام کے لیے کیوں ضروری ہے کہ وہ زبردست عالم ہو ؟

(۵) —— کس دلیل کی بنا پر امام کو سب سے زیادہ شجاع ، سب سے زیادہ زاھد و متقی اور اخلاقی لحاظ سے سب سے زیادہ جاذب شخصیت کا مالک ہونا چاہیئے ؟

چوتھا سبق

امامؑ کو کون مقرّر کرے؟

مسلمانوں کا ایک گروہ (اہلسنت) اس بات کا معتقد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تادمِ حیات کسی کو بھی اپنا جانشین مقرر نہیں کیا اور یہ مسلمانوں کا اپنا فریضہ ہے کہ اپنے لیے خود ہی راہبر و پیشوا منتخب کریں اور "اجماع مسلمین" کے ذریعے جو ایک دلیلِ شرعی ہے یہ کام سرانجام پانا چاہیے۔

وہ کہتے ہیں کہ:

یہ کام انجام پاگیا اور مسلمانوں کا پہلا "خلیفہ" اجماع امت کے ذریعہ منتخب کرلیا گیا۔

اور اس نے "دوسرے خلیفہ" کو اپنے جانشین کی حیثیت سے نامزد کیا۔

اور خلیفہ دوم نے اپنا جانشین منتخب کرنے کے لیے ایک چھ رکنی کمیٹی تشکیل دی جو حضرت علیؑ ، عثمان ، عبدالرحمن بن عوف ، طلحہ ، زبیر اور سعد بن ابی وقاص پر مشتمل تھی۔

چنانچہ اس کمیٹی نے تین ووٹوں کی اکثریت (یعنی سعد بن ابی وقاص ، عبدالرحمن اور طلحہ کی آراء) سے عثمان کا انتخاب کر لیا۔ (یاد رہے ، خلیفہ دوم نے پہلے سے وضاحت کر دی تھی کہ اگر تین افراد ایک طرف ہوں اور تین دوسری طرف تو جس کی طرف عثمان کے داماد عبدالرحمن بن عوف کا ووٹ ہوگا وہی خلیفہ چن لیا جائے گا)

عثمان کی خلافت کے آخری ایام میں مختلف وجوہات کی بنا پر لوگ ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور انھیں قتل کر دیا۔

عثمان کو اتنی فرصت نہ مل سکی کہ ذاتی طور پر کسی کو اپنا جانشین نامزد کر جائیں یا کوئی کمیٹی تشکیل دے دیں۔

اس دوران میں لوگوں نے علیؑ کا رخ کیا اور جانشین پیغمبرؐ کی حیثیت سے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ سوائے شام کے گورنر معاویہ کے جنھیں یقین تھا کہ علیؑ انھیں اپنے منصب پر باقی نہیں رہنے دیں گے۔

معاویہ نے علم بغاوت بلند کر دیا جو کہ تاریخ اسلام میں ایسے ناخوشگوار اور خونریز حادثات کا سبب بنا جس میں ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کا خون بہہ گیا۔

علمی اور تاریخی لحاظ سے بحث کی وضاحت کے لیے اس مقام پر بہت سے سوالات پیش آتے ہیں ،

جن میں سے چند ایک یہ ہیں :

۱۔ آیا امت پیغمبرؐ کا جانشین مقرر کر سکتی ہے ؟

اس سوال کا جواب چنداں پیچیدہ نہیں ہے ،

کیونکہ اگر امامت کے معنی " مسلمانوں کی ظاہری سربراہی " لیں تو ظاہر ہے کہ عوامی رائے کے ذریعہ سے حکومت کے سربراہ کا انتخاب روزمرہ کا معمول ہے ۔

لیکن اگر امامت کو اس معنی میں لیا جائے جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں اور قرآن مجید سے اس کو بیان کر چکے ہیں تو یقیناً سوائے خدا یا رسولِ خدا کے (اور وہ بھی خدائی حکم کے ذریعے) کوئی شخص بھی کسی کو امام یا خلیفہ مقرر نہیں کر سکتا ۔

کیونکہ امامت کی اس تفسیر کے مطابق امامؑ کے لیے شرط ہے کہ وہ اسلام کے تمام اصول اور فروع کا مکمل علم رکھتا ہو۔ جس کے علم کا سرچشمہ خدا کا علم ہو ۔ جو پیغمبرؐ کے علم کا وارث ہو تاکہ وہ شریعت اسلام کی حفاظت کر سکے ۔

دوسری شرط یہ ہے کہ

امام معصوم ہو ، یعنی خدا کی طرف سے وہ ہر قسم کے گناہ اور خطا کے ارتکاب سے محفوظ ہو۔ تاکہ امتِ اسلامیہ کی معنوی و مادی، ظاہری اور باطنی امامت اور رہبری کو اچھی طرح سنبھال سکے ۔

اسی طرح زہد و پارسائی ، تقوی اور شہامت ، شجاعت اور بہادری اس منصب کے لیے ضرور ہیں ۔

ان شرائط کو سوائے خدا اور رسولؐ خدا کے اور کوئی تشخیص نہیں دے سکتا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ روحِ عصمت کس شخص کے اندر پرتو افگن ہے؟

وہی اچھی طرح جان سکتا ہے کہ مقام امامت کے لیے ضروری علم کس کے اندر موجود ہے؟

زھد، پارسائی، تقویٰ، شجاعت اور شہامت جیسی صفات کس کے اندر پائی جاتی ہیں؟

جو لوگ پیغمبرؐ کے خلیفہ اور امام کا انتخاب لوگوں کے سپرد کرتے ہیں، درحقیقت وہ امامت کے قرآنی مفہوم کو تبدیل کر کے امامت کو صرف حکومت کی معمولی سربراہی اور لوگوں کے روزمرہ کے دنیاوی مسائل کو سنبھالنے تک محدود کرتے ہیں۔

وگرنہ امامت اپنے جامع اور کامل معنی کے لحاظ سے صرف خداوند عالم ہی کے لیے قابل تشخیص ہے۔ اور صرف خداوند متعال ہی ایسی صفات سے اچھی طرح باخبر ہوتا ہے۔

بالکل ویسے ہی جیسے پیغمبر کو لوگوں کے ووٹوں سے منتخب نہیں کیا جاسکتا، بلکہ ضروری ہے کہ وہ خدا کی جانب سے منتخب ہو اور معجزات کے ذریعے اپنا تعارف کرائے۔ کیونکہ پیغمبر کے لیے جن شرائط کا ہونا ضروری ہے وہ خدا ہی بہتر سمجھتا ہے کہ یہ صفات کس کے اندر پائی جاتی ہیں۔

۲۔ کیا پیغمبرؐ نے اپنا جانشین مقرر نہیں کیا؟

اس میں شک نہیں ہے کہ اسلام ایک "عالمی" اور "جاودانی"

آئین ہے۔ قرآن کی صریح آیات کے مطابق کسی خاص زمان اور مکان تک محدود نہیں۔

اور اس میں بھی شک نہیں کہ پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے وقت یہ آسمانی دین جزیرہ نمائے عرب سے آگے نہیں بڑھا تھا۔

ادھر پیغمبر اسلامؐ نے مکہ میں تیرہ سال صرف شرک اور بت پرستی کے خلاف جہاد میں گزار دیے۔ زندگی کے آخری دس سال جو ہجرت سے لے کر اسلام کے پروان چڑھنے کی مدت ہے وہ بھی اکثر و بیشتر غزوات اور دشمن کی طرف سے مسلط کردہ جنگوں میں گزر گئے۔

اگرچہ آنحضرتؐ نے رات دن اسلامی مسائل کی تبلیغ اور تعلیم میں گزار دیے۔ اسلام کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی پوری پوری کوشش کرتے رہے لیکن پھر بھی بہت سے ایسے مسائل ہیں جن کے حل کی ہر زمانے میں ضرورت محسوس رہتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ کوئی ایسا شخص ہو جو پیغمبر اسلامؐ کی طرح اس عظیم ذمہ داری کو پوری طرح سنبھال سکے۔

ان سب سے قطع نظر آئندہ کے حالات کو مدنظر رکھ کر درپیش آنے والے خطرات کا سدباب کرنا اور مشن کو آگے بڑھانے کے مقدمات فراہم کرنا، ایسے امور ہیں جن کے متعلق ہر رہبر پہلے سے تدبیریں سوچتا ہے اور کسی بھی صورت میں اسے فراموش نہیں کر سکتا۔

اور پھر اس کے علاوہ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ پیغمبر اسلامؐ نے زندگی کے سادہ سے سادہ اور عام سے عام مسائل تو بیان کر دیے ہوں لیکن جس مسئلہ کا تعلق تمام مسلمانوں کی رہبری، امامت اور پیغمبرؐ کی خلافت سے ہو اس کے لیے کوئی واضح پروگرام نہ دیا ہو۔؟

مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جانشین کی تعیین کے لیے یقیناً اقدام کیا ہے کہ جس کی تصریح ہم انشاء اللہ آگے چل کر بیان کریں گے اور مسلّمہ روایات کو نمونے کے طور پر پیش کریں گے جو اس حقیقت کو اجاگر کریں گی کہ پیغمبر اسلامؐ اپنی زندگی کے دوران کسی بھی لمحے اس ضروری مسئلے سے غافل نہیں رہے۔ ہر چند آپؐ کے بعد خاص سیاسی تحریکوں نے اس حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی اور لوگوں کو یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی کہ پیغمبر اسلامؐ نے اپنا کوئی جانشین مقرر نہیں کیا۔

آیا یہ بات قابل قبول ہو سکتی ہے کہ

جب بھی رسول خداؐ چند دنوں کے لیے غزوات پر جاتے تو (غزوۂ تبوک کی مانند) مدینہ کو خالی نہیں چھوڑتے تھے۔ بلکہ اپنا جانشین مقرر کر کے جاتے۔

لیکن آپؐ نے اس دنیا سے جاتے وقت اپنا جانشین مقرر کرنے کی کوئی فکر نہیں کی؟ اور امت کو اختلافات اور سرگردانیوں کے بھنور میں کسی راہبر اور پیشوا کے بغیر چھوڑ کر چلے گئے؟ اور ایک کامل رہنما کی صورت میں اسلام کے مستقبل کی ضمانت دے کر نہیں گئے؟

جانشین کی تعیین نہ کرنا یقیناً نوخیز اسلام کے لیے بہت خطرات کا حامل تھا اور عقل اور منطق کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ اسلام کی حفاظت کے لیے جانشین کا مقرر نہ کرنا پیغمبرؐ جیسی عظیم ذات سے محال ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اپنے جانشین کا انتخاب آپؐ نے امّت کے حوالے کر دیا تھا کم از کم کوئی ثبوت تو پیش کریں جس میں صراحت کے ساتھ اس موضوع کی طرف اشارہ ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ ان کے پاس اس سلسلے میں کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں ہے۔

۳۔ اجماع اور شوریٰ

فرض کیجیے کہ آنحضرتؐ نے اس اہم کام کی طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی۔ بلکہ خلافت کا یہ معاملہ امّت کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کا فرض بنتا تھا کہ وہ خلیفہ کا انتخاب "اجماع" کے ذریعے کریں۔ چنانچہ انھوں نے اجماع کے ذریعے خلیفہ کا انتخاب کیا۔

لیکن ہر ایک جانتا ہے کہ "اجماع" سے مراد "تمام مسلمانوں کا اتفاق" ہے۔ اور خلیفہ اوّل کی خلافت کے بارے میں اس قسم کا "اتفاق" حاصل نہیں ہو سکا جسے "اجماع" کا نام دیا جائے۔

صرف چند ایک صحابہ نے جو مدینہ میں تھے یہ فیصلہ کرلیا۔ اور باقی شہروں کے مسلمانوں نے اس "اجماع" میں شرکت نہیں کی۔ اور پھر مدینہ میں بھی حضرت علیؑ اور بنی ہاشم کا بہت بڑا گروہ اس "اجماع" میں شریک نہیں تھے۔

جب صورت حال یہ ہو تو کس طرح ہم اسے "اجماع" کا نام دے سکتے ہیں ؟

اور پھر اگر یہ طریقہ کار صحیح تھا تو "خلیفہ اول" نے اپنا جانشین منتخب کرنے کے لیے ایسا کیوں نہیں کیا ؟

انھوں نے کیوں براہ راست ایک آدمی کو نامزد کردیا ؟

اگر ایک فرد کا تعین کرنا کافی ہے تو پھر تو آنحضرتؐ اس کام کے لیے زیادہ موزوں اور مناسب تھے اور اگر بعد میں لوگوں کی بیعت اس مسئلے کو حل کرسکتی ہے تو پیغمبرؐ کے بارے میں تو بدرجہ اولیٰ حل کرسکتی ہے ؟

اور پھر ایک تیسری شکل "خلیفہ سوم" کے بارے میں درپیش آئے گی اور وہ یہ کہ :

جس "طریقہ کار" کے ذریعہ "خلیفہ اوّل" منتخب ہوئے تھے "خلیفہ دوم" نے اسے کیوں ترک کر دیا ؟

اور جس ذریعہ سے وہ خود نامزد ہوئے تھے اس پر کیوں عمل نہ کیا ؟ یعنی نہ تو اجماع کا راستہ اپنایا اور نہ ہی ایک شخص کو خود نامزد کیا بلکہ ایک خاص کمیٹی (شوریٰ) کو اس اہم کام کی ذمہ داری سونپی۔

اور پھر اصولی طور پر اگر شوریٰ (کمیٹی) صحیح ہے تو پھر اسے چھ اشخاص کے درمیان محدود کرنے کے کیا معنی ؟

اور پھر ایسا کیوں ہو کہ تین آدمیوں کی رائے چھ آدمیوں کی رائے کے برابر سمجھی جائے ؟

یہ ایسے سوالات ہیں جو تاریخ کے ہر طالب علم کو پیش آتے ہیں اور جب اسے تسلی بخش جواب نہیں ملتا تو وہ سمجھتا ہے کہ :

"امام کے مقرر کرنے کا یہ طریقہ نہیں تھا۔"

۴۔ علیؑ سب سے اولیٰ تھے

فرض کیجیے کہ آنحضرتؐ نے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں کیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرض کر لیں کہ جانشین کا انتخاب امت کے ذمہ تھا۔

تو کیا یہ بات صحیح ہے کہ

انتخاب کے وقت ایسے شخص کو نظر انداز کر دیا جائے جو علم تقویٰ اور دوسری خصوصیات کے لحاظ سے دوسروں سے افضل ہو۔ اور ایسے

لوگوں کا انتخاب کرلیا جائے جو اس سے کئی درجہ بعد میں تھے ؟؟

مسلم دانشوروں کا ایک طبقہ جن میں اہلسنت کے علماء بھی داخل ہیں بڑی وضاحت کے ساتھ لکھ چکے ہیں کہ :

" اسلامی مسائل کو جتنا علیؑ سمجھتے تھے اتنا کوئی دوسرا نہیں ۔"

جو روایات آپؑ کے بارے میں ہم تک پہنچی ہیں وہ اس حقیقت کی شاھد ہیں ۔ تاریخ اسلام کہتی ہے کہ :

وہ علمی مشکلات اور مسائل میں مسلمانوں کی جائے پناہ تھے ۔ حتیٰ کہ اگر دیگر خلفاء سے کوئی مشکل علمی مسئلہ پوچھا جاتا تو وہ بھی سائل کی علیؑ کی طرف راہنمائی کرتے تھے ۔

حضرت علیؑ کی شجاعت ، شہامت ، زھد ، تقویٰ اور دوسری برجستہ صفات ایسی تھیں جن میں کوئی بھی آپ کی برابری نہیں کرسکتا تھا ۔ بنا بریں اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ خلیفہ کا انتخاب خود امت کا کام تھا تو اس منصب کے لیے علیؑ سے بڑھ کر کوئی شخص زیادہ لائق اور شائستہ نہ تھا ۔

؟ سوالات

① ــــــ لوگ امام اور خلیفہ کا انتخاب کیوں نہیں کرسکتے ؟

۲ — آیا عقلی اور منطقی لحاظ سے پیغمبرؐ نے اپنا جانشین مقرر کیا تھا یا نہیں ؟

۳ — پہلے تین خلفاء کا طریقہ انتخاب کیا تھا ؟

۴ — آیا ان کے انتخاب کے طریقہ کار علمی اور اسلامی نکتہ نظر سے صحیح تھے ؟

۵ — کس دلیل کی بنا پر علیؑ خلافت کے لیے سب سے زیادہ لائق اور شائستہ تھے ؟

پانچواں سبق

قرآن اور امامت

قرآن مجید یہ عظیم آسمانی کتاب، جو تمام چیزوں کے بارے میں ہماری مشکلات کا حل پیش کرتی ہے، نے مسئلہ امامت کو بھی مختلف پہلوؤں سے حل کر دیا ہے۔

۱۔ قرآن، امامت کو خدا کی جانب سے سمجھتا ہے

جیسا کہ ابراہیمؑ بت شکن کے بارے میں پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید نے آنجنابؑ کی امامت اور پیشوائی کا مرحلہ نبوّت، رسالت، اور بڑی بڑی آزمائشوں سے گزرنے کے بعد بتایا ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت ۱۲۴ میں فرماتا ہے:

" وَاِذِ ابْتَلٰی اِبْرٰهِیْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۔"

" خداوند عالم نے ابراہیمؑ کو بہت بڑی آزمائش میں مبتلا کیا اور وہ اس آزمائش میں بخوبی پورے اُترے تو خدا نے فرمایا میں تمھیں لوگوں کا امام اور پیشوا قرار دیتا ہوں ۔"

قرآن اور تاریخ کے مختلف قرائن بتاتے ہیں کہ آپؑ کو امامت کا یہ عہدہ بابل کے بت پرستوں کے ساتھ جہاد ، شام کی طرف ہجرت ، خانہ کعبہ کی تعمیر اور اپنے فرزند اسماعیل علیہ السلام کو قربان گاہ لے جانے کے بعد ملا ۔

جب نبوت اور رسالت کا عہدہ خدا کی طرف سے عطا ہوتا ہے تو لوگوں کی رہبری اور امامت جو رہبری کا درجۂ کمال ہوتا ہے کو بطریق اولیٰ خدا کی جانب سے ہونا چاہیے اور یہ ایسی چیز نہیں ہے جو لوگوں کے انتخاب کے ذریعے امکان پذیر ہو ۔

اور پھر یہ کہ قرآن مجید خود یوں فرماتا ہے

" انی جاعلك للناس اماما "

" یعنی میں (خدا) آپؑ (ابراہیم) کو امام مقرر کرتا ہوں ۔"

جیسا کہ سورۂ انبیاء کی آیت ۷۳ میں خداوندِ عالم حضرت ابراہیم ، لوط ، اسحاق اور یعقوب علیہم السّلام کے بارے میں فرماتا ہے :

" وَجَعَلْنَاهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا "

" ہم نے انھیں امام بنایا ہے اور وہ ہمارے فرمان کے مطابق لوگوں کی ہدایت کے فرائض انجام دیتے ہیں ۔"

قرآن مجید کی بعض دوسری آیات میں ایسی تعبیرات پائی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منصب الٰہی خداوندعالم ہی کے ذریعے عطا ہوتا ہے ۔

ان تصریحات کے علاوہ جب ہم ابراہیم علیہ السلام کی امامت کے بارے میں پڑھتے ہیں کہ آنجناب نے عہدہ امامت کا تقاضا اپنی اولاد کے لیے کیا اور اپنی آنے والی نسل کے لیے امامت کی درخواست کی تو خداوندعالم نے فرمایا :

" لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ "

" میرا عہدِ امامت ظالموں کو نہیں ملے گا ۔"

اس بات کی طرف اشارہ ہے :

آپ کی دعا تو قبول کرتا ہوں لیکن آپ کی اولاد میں سے جو لوگ ظلم کا ارتکاب کریں گے وہ کبھی اس بلند مرتبے تک نہیں پہنچ سکیں گے ۔

اگر ظلم کا لغوی معنیٰ دیکھا جائے اور پھر یہ دیکھا جائے کہ قرآن مجید

نے ظلم کسے کہا ہے ؟ تو معلوم ہوگا کہ اس کا بہت وسیع مفہوم ہے جو تمام گناہوں کو اپنے دائرے میں شامل کرلیتا ہے۔

اس دائرے میں کھلم کھلا اور مخفی شرک سے لے کر اپنے اور دوسروں پر ظلم کرنا تک شامل ہے ۔ اور پھر یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ اس سے مکمل آگاہی سوائے خدا کی ذات کے اور کسی کو حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ صرف خدا ہی ہے جو لوگوں کی نیتوں اور ان کے باطن کے حالات سے آگاہ ہوتا ہے ۔

لہٰذا یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اس عہدے کی تعیین اور تقرری صرف اور صرف خدا کے ہاتھ میں ہے ۔

۲۔ آیۂ تبلیغ

خداوند عالم سورہ مائدہ کی آیت ۶۷ میں فرماتا ہے :

" یَاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ
اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ
فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ
یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ "

" اے رسولؐ جو تمھارے پروردگار کی طرف سے
تم پر نازل ہوا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دو اور

اگر تم نے یہ کام نہیں کیا تو (یاد رکھو) رسالت
کا کوئی کام انجام نہیں دیا۔ اور تمھیں خداوندعالم
لوگوں (کے ہر ممکن خطرات) سے محفوظ رکھے گا
اور خداوندعالم کافروں کو ہدایت نہیں کرتا۔"

اس آیت کے تیور بتا رہے ہیں کہ پیغمبرؐ کے ذمّہ نہایت ہی اہم کام لگایا گیا ہے جس کی وجہ سے آپؐ کو چاروں طرف سے مشکلات دکھائی دے رہی ہیں۔ ہر طرف سے لوگوں کی ممکنہ مخالفت کا سامنا نظر آرہا ہے لہٰذا آیت میں تاکید کی جا رہی ہے اور ممکنہ خطرات اور پریشانیوں سے بچاؤ کی ضمانت دی جا رہی ہے۔

اور یہ بھی ہر ایک کو معلوم ہے کہ یہ اہم ترین مسئلہ توحید یا رسالت کی تبلیغ اور شرک وکفر کے خلاف مہم سے بھی تعلق نہیں رکھتا کیونکہ اس وقت (یعنی سورۂ مائدہ کی اس آیت کے نزول کے وقت) تک یہ مسائل پوری طرح حل ہو چکے تھے۔

اور پھر یہ کہ اسلام کے معمولی احکام کی تبلیغ کے بارے میں اس قدر اہتمام اور انتظام کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ آیت کے ظاہری معنی بتا رہے ہیں کہ ایک ایسے کام کی تبلیغ کا حکم ہے جو "نبوت اور رسالت کے ہم پلّہ" ہے کہ اگر یہ کام انجام نہیں پاتا تو گویا رسالت کا کوئی کام ہی انجام نہیں پاتا۔ اور حقِ رسالت ادا ہی نہیں ہوتا۔

تو کیا ایسا اہم ترین اور سنگین ترین کام، پیغمبرؐ کی خلافت اور جانشینی کے علاوہ کچھ اور ہو سکتا ہے۔

بالخصوص جب یہ آیت آنحضرتؐ کی زندگی کے آخری ایام میں

نازل ہوئی ہے اور مسئلہ خلافت سے مناسبت رکھتی ہے۔ جو نبوت اور رسالت کے مسائل کو آگے بڑھانے کا ذریعہ ہے۔

اس کے علاوہ بہت سی روایات میں پیغمبر اسلامؐ کے اصحاب از قبیلِ "زید بن ارقم" ـــــ "ابوسعید خدری" ـــــ ابن عباس ـــــ "جابر بن عبداللہ انصاری" ـــــ "ابوہریرہ" ـــــ حذیفہ یمانی ـــــ اور ـــــ "ابن مسعود" جیسے حضرات سے منقول ہے۔ جن میں سے بعض روایتیں گیارہ طریقوں سے ہم تک پہنچی ہیں اور اہل سنت کے مفسرؒ، محدثؒ اور مؤرخ علماء کے بہت بڑے گروہ نے تحریر کیا ہے کہ:

مندرجہ بالا آیت، حضرت علیؑ اور غدیر خم کے واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے [1]

واقعۂ غدیر کو توانشاء اللہ "روایت و سنت" کی بحث میں تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔ یہاں پر صرف اس قدر بتائیں گے کہ یہ آیت اس بات کی طرف واضح طور پر راہنمائی کرتی ہے کہ

پیغمبر اسلام پر فرض عائد ہو چکا تھا کہ آخری حج سے واپس آنے کے بعد اپنی زندگی کے آخری ایام میں علی علیہ السلام کو باقاعدہ طور پر اپنا جانشین نامزد کر کے مسلمانوں سے ان کا مکمل تعارف کرائیں۔

۳۔ آیہ اطاعتِ اولی الامر

سورہ نساء کی آیت نمبر ۵۹ میں خداوند عالم فرماتا ہے:

---

[1] تفصیلات کے لیے "احقاق الحق"، "الغدیر"، "المراجعات" اور "دلائل الصدق" جیسی معتبر کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔

"یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ"

"اے ایمان لانے والو خدا کی اطاعت کرو اور رسولؐ اور اولوالامر کی اطاعت کرو۔"

اس مقام پر "اولوالامر" کی اطاعت کو غیر مشروط طور پر خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

آیا "اولوالامر" سے مراد وقت کے حاکم ہیں؟ جو مختلف دوران میں اور مختلف مقامات پر حکومت کرتے ہیں؟

اور مثال کے طور پر موجودہ دور میں ہر ملک کے مسلمانوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے ملک کے سربراہوں کی غیر مشروط اطاعت کریں؟ (جیسا کہ بہت سے اہلسنت مفسرین نے کہا ہے)

اگر ایسا ہے تو یہ نظریہ کسی بھی منطق کے مطابق نہیں۔ کیونکہ اکثر ممالک میں مختلف ادوار میں گمراہ، فاسق و فاجر، ظالم اور غلط کار حکمران بھی حکومت کرتے رہے ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں۔

اور اگر اس سے مراد ایسے حکمرانوں کی اطاعت فرض ہے جو احکام اسلام کے خلاف حکم نہ چلائیں۔ یعنی ان کی اطاعت مشروط ہے۔ جبکہ آیت مطلق اور غیر مشروط اطاعت کا حکم دیتی ہے۔

اور اگر اس سے مراد پیغمبر اکرمؐ کے مخصوص اصحاب ہیں تو پھر

بھی آیت کے وسیع مفہوم کے خلاف ہے کیونکہ آیت ہر دور اور زمانے کے لیے ہے۔

بنابریں یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اس سے مراد ایسے معصوم پیشوا ہیں جو ہر دور اور ہر زمانے میں موجود ہوتے ہیں اور غیر مشروط طور پر جن کی اطاعت فرض ہے اور خدا و رسولؐ کے حکم کی مانند ان کا حکم بھی واجب العمل ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ اسلامی مآخذ میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں جو "اولو الامر" کا مصداق علی بن ابی طالبؑ اور دیگر ائمہ معصومین کو بتاتی ہیں اور ہمارے مدعا پر واضح دلیل ہیں[۱]

۴- آیۂ ولایت

سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۵۵ میں ہے :

" اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ "

" تمہارا ولی اور سرپرست صرف خدا ہے اور

---

[۱] مزید تفصیلات کے لیے تفسیر نمونہ جلد سوم صفحہ ۳۵ کا مطالعہ کیجیے۔

اس کا رسولؐ ہے اور وہ ایماندار لوگ ہیں جو
نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں
زکوٰۃ ادا کرتے ہیں ۔"

قرآن مجید نے کلمہ " اِنَّمَا " کے ساتھ مسلمانوں کی ولایت اور سرپرستی کو تین ذاتوں میں منحصر کر دیا ہے ۔

خدا ، رسولؐ اور وہ مومن لوگ جو حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں (یاد رہے کہ عربی اصطلاح میں" اِنَّمَا "حصر کا معنی دیتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "اس کے سوا اور کچھ نہیں)

اس میں شک نہیں کہ "ولایت " سے " مسلمانوں کی آپس میں دوستی " مراد نہیں ہو سکتی ۔ کیونکہ عمومی دوستی کے لیے مندرجہ بالا شرط کی ضرورت نہیں ہوتی اور تمام مسلمان آپس میں دوست اور بھائی ہیں خواہ وہ حالتِ رکوع میں زکوٰۃ نہ بھی دیں ۔ بنا بریں یہاں " ولایت " سے مراد مادی اور معنوی قیادت اور سرپرستی ہے ۔ خاص کر جب " ولایت خدا " اور " ولایت رسولؐ " کے ساتھ اس کا ذکر آیا ہے ۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ

مندرجہ بالا آیت میں جن اوصاف کا ذکر ہے وہ ایک معین شخص کے بارے میں اشارہ ہے جس نے حالتِ رکوع میں زکوٰۃ ادا کی ہے وگرنہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر انسان رکوع کی حالت میں زکوٰۃ دے ۔

درحقیقت یہ ایک نشانی ہے نا کہ ایک صفت ۔

یہ تمام قرائن بتاتے ہیں کہ مندرجہ بالا آیت امیر المومنین علی علیہ السلام کی اس مشہور داستان کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے جب آپ دوران نماز

حالتِ رکوع میں تھے کہ ایک سائل نے مسجدِ نبویؐ کے دروازے پر کھڑے ہو کر سوال کیا لیکن کسی نے اس کو کچھ نہ دیا اور علی علیہ السّلام نے اپنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے اسے اشارہ کیا۔ اور اس نے فوراً اسی انگلی سے گراں قیمت انگشتری اتار لی۔

پیغمبرِ اکرمؐ اپنی آنکھوں سے یہ ماجرا دیکھ رہے تھے۔ علیؑ نے نماز ختم کی اور پیغمبرؐ نے ان الفاظ میں دعا مانگی:

"خداوندا! میرے بھائی موسیٰ علیہ السّلام نے تجھ سے سوال کیا تھا کہ اس کے سینے کو کشادہ کر دے، اس کے کاموں کو آسان کر دے، اس کی زبان کی گرہوں کو کھول دے اور ان کے بھائی ھارون کو ان کا وزیر اور معاون قرار دے ...... میرے اللہ! میں محمدؐ تیرا برگزیدہ رسول ہوں میرے سینے کو کشادہ کر دے، میرے کاموں کو آسان کر دے اور میرے خاندان سے میرے بھائی علیؑ کو میرا وزیر قرار دے دے تاکہ اس کے ذریعے میری کمر مضبوط ہو......"

ابھی آپؐ کی یہ دعا ختم بھی نہ ہو پائی تھی کہ جبرائیلِ امین مندرجہ بالا آیت لے کر آ گئے۔

اور پھر مزے کی بات یہ ہے کہ اہلسنت کے بہت سے مفسرین، مورخین اور محدثین نے اس آیت کا شانِ نزول یہی بیان کیا ہے جس کا تذکرہ مندرجہ بالا سطور میں ہے۔ اور دس سے زیادہ اصحابِ رسولؐ نے ذاتی طور پر یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے۔

اس ولایت کے بارے میں اور بھی بہت سی آیات ہیں لیکن ہم نے اس مختصر سی کتاب میں صرف مندرجہ بالا چار آیات کو ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے۔

سوالات

۱ — قرآنی نکتۂ نظر سے امام کا تقرر کس کے ہاتھ میں ہے؟

۲ — آیۂ تبلیغ کن حالات میں نازل ہوئی ہے اور اس کا کیا مفہوم ہے؟

۳ — غیر مشروط اطاعت کن لوگوں کے بارے میں معقول ہے؟

۴ — کس دلیل کے ساتھ آیہ "إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللهُ...... " امامت اور رہبری پر دلالت کرتی ہے؟

چھٹا سبق

امامت اور سنّتِ رسولؐ

کتبِ احادیث خاص کر اہل سنّت بھائیوں کی کتابوں کے مطالعہ سے انسان کو کثیر تعداد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ایسی احادیث ملیں گی جو علی علیہ السلام کی امامت اور خلافت پر دلالت کرتی ہیں۔

لیکن اس وقت ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس مسئلے کے بارے میں اس قدر زیادہ احادیث موجود ہیں کہ کسی قسم کے شک کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ پھر کس لیے کچھ لوگ اہلبیتؑ کے راستے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرتے ہیں؟

ان میں سے (حدیثِ غدیر کی مانند) کچھ ایسی احادیث ہیں جن کی سینکڑوں سندیں ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جن کی بیسیوں سندیں ہیں اور بیسیوں مشہور اسلامی کتابوں میں موجود ہیں۔ اور اس قدر واضح ہیں کہ اگر ادھر ادھر کی

باتیں سنے بغیر اور اندھی تقلید کو چھوڑ کر ان کا مطالعہ کیا جائے تو خلافت علیؑ کی بات اس قدر واضح ہو جائے کہ کسی اور دلیل کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

اتنی ڈھیر ساری احادیث میں سے چند ایک کو ہم نمونے کے طور پر یہاں ذکر کرتے ہیں اور جو لوگ اس سلسلے میں مزید احادیث کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے معتبر کتابوں کی طرف راہنمائی کریں گے[1]

۱۔ حدیثِ غدیر

بہت سے اسلامی مؤرخین نے لکھا ہے کہ:

پیغمبر اسلامؐ جب اپنا آخری حج بجا لائے اور مراسم حج سے مکمل طور پر فارغ ہو گئے تو اپنے نئے اور پرانے ساتھیوں اور حج کے لیے حجاز اور دوسرے علاقوں کے گوشے گوشے سے آنے والے مسلمانوں کے ساتھ مکہ سے سرزمین "جحفہ" پہنچ گئے جو مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہے۔

پھر وہاں سے ایک گرم اور خشک مقام پر پہنچے جس کا نام "غدیر خم" ہے جو درحقیقت ایک چار راہ کی حیثیت رکھتا ہے اور جہاں سے حجاز کے مختلف علاقوں کو راستے جاتے تھے۔

اس سے پہلے کہ حجاج کرام ایک دوسرے سے الگ ہوں، پیغمبر خدا نے حکم دیا کہ سب لوگ یہیں پر ٹھہر جائیں اور جو لوگ آگے جا چکے تھے انھیں واپس بلایا گیا اور جو پیچھے رہ چکے تھے ان کا انتظار کیا گیا۔

---

[1] ایسے حضرات کو چاہیے کہ وہ "المراجعات" "الغدیر" اور "نوید امن وامان" جیسی کتابوں کا مطالعہ کریں۔

جب سب لوگ اکٹھے ہو گئے۔

زبردست گرمی تھی، جلا دینے والی لُو چل رہی تھی اور لق و دق صحرا میں کہیں پر سائے کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

مسلمان ظہر کی نماز آنحضرت ؐ کی اقتدا میں ادا کرنے کے بعد جب اپنے اپنے خیموں کی طرف واپس جانے لگے تو پیغمبرِ خدا ؐ نے فرمایا:

"خدا کا ایک اہم اور تازہ فرمان سننے کے لیے تیار ہو جائیں۔"

اونٹوں کے پالانوں کا منبر تیار کیا گیا۔ آپؐ منبر پر تشریف لے گئے خدا کی حمد و ثنا بجا لانے کے بعد لوگوں سے یوں مخاطب ہوئے:

"عنقریب میں خدا کی دعوت کو لبیک کہہ کر تم سے جُدا ہونے والا ہوں۔ کچھ ذمہ داریاں مجھ پر عائد ہوتی ہیں اور کچھ تم پر۔ تم لوگ میرے بارے میں کیا گواہی دیتے ہو؟"

سب نے بلند آواز کے ساتھ یک زبان ہو کر کہا:

"نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَ نَصَحْتَ وَجَهَدْتَّ فَجَزَاكَ اللّٰهُ خَيْرًا"

"ہم سب گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے تبلیغ کا حق پوری طرح ادا کر دیا ہے، نصیحت اور خیرخواہی

کے حق کو پورا کیا ہے۔ ہماری ہدایت کیلیے ہر ممکن
کوشش کی ہے۔ خداوند عالم آپؐ کو جزائے خیر
عطا فرمائے۔"
پیغمبرؐ نے فرمایا:
"آیا آپ لوگ خدا کی وحدانیت، میری رسالت،
روز قیامت کی حقیقت اور حقانیت اور اس دن
مُردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کی گواہی دیتے ہیں؟"
سب نے مل کر کہا:
"ہم ضرور گواہی دیتے ہیں۔"
تو آنحضرتؐ نے فرمایا:
"خداوندا! گواہ رہنا۔"
پھر آپؐ نے فرمایا:
"لوگو! کیا میری آواز آپ سب تک پہنچ رہی ہے؟"
سب نے کہا: ـــــــ "ضرور پہنچ رہی ہے۔"
پھر مجمع پر یکدم سناٹا چھا گیا، بلکہ تمام صحرا پر مکمل سکوت
طاری ہو گیا۔ سوائے ہوا کی سرسراہٹ کے اور کچھ نہیں سنائی دیتا تھا۔ آنحضرتؐ
نے سکوت کو توڑا اور فرمایا:
"مجھے یہ بتاؤ کہ یہ جو دو گرانقدر چیزیں میں تمھارے
درمیان چھوڑ رہا ہوں ان کے ساتھ تم کیا سلوک
کرو گے؟"
کسی نے مجمع سے آواز بلند کی:

"وہ کون سی دو گرانقدر چیزیں ہیں یا رسول اللہ؟"

آپؐ نے فرمایا:

"پہلی چیز "ثقل اکبر" ہے جو خدا کی کتاب قرآن مجید ہے۔ کبھی اس کا دامن اپنے ہاتھ سے نہ چھوٹنے دینا ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے۔ اور میری دوسری گرانقدر یادگار میرا خاندان اور میرے اہلبیت ہیں۔ اور خداوند لطیف و خبیر نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہیں ہوں گی جب تک کہ مجھ تک بہشت میں نہ پہنچ جائیں۔ نہ تو کبھی ان دونوں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا اور نہ ہی ان سے پیچھے رہ جانا ورنہ ہر حالت میں تمھاری ہلاکت ہے۔"

پھر ناگہاں آپؐ نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی گویا کسی کو تلاش کر رہے ہیں۔ جب آپؐ نے علیؑ کو دیکھا تو فوراً جھک کر ان کا ہاتھ پکڑا اور انھیں اپنے پاس اوپر اٹھا لیا یہاں تک کہ دونوں کی بغلوں کی سفیدی صاف نظر آ رہی تھی اور سب لوگوں نے علیؑ کو دیکھا اور پہچان لیا۔

اس مرحلے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز میں بلندی آگئی اور فرمایا:

"اَیُّھَا النَّاسُ مَنْ اَوْلَی النَّاسِ بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ ؟

" مومنین کی جانوں پر ان کی نسبت کون شخص
زیادہ تصرف کا حق رکھتا ہے ؟ "

سب نے کہا :

" اللہ اور اس کے رسولؐ بہتر جانتے ہیں ۔"

تو آپؐ نے خود ہی فرمایا :

" خدا میرا مولا اور رہبر ہے اور میں مومنین کا
مولا اور رہبر ہوں اور ان کی جانوں پر ان کی
اپنی نسبت تصرف کا زیادہ حق رکھتا ہوں ۔"

پھر آپؐ نے فرمایا :

" مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَ (ھٰذَا)
عَلِیٌّ مَوْلَاہُ ۔"

" جس جس کا میں مولا اور رہبر ہوں اس اس
کا (یہ) علیؑ مولا اور رہبر ہے ۔"

آپؐ نے یہ جملہ تین بار بلکہ بعض روایات کے مطابق چار بار دہرایا
اور پھر آسمان کی طرف منہ کرکے یہ دعا کی ۔

" اَللّٰھُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاہُ وَعَادِ مَنْ
عَادَاہُ وَاَحِبَّ مَنْ اَحَبَّہٗ وَ
اَبْغِضْ مَنْ اَبْغَضَہٗ ، وَانْصُرْ

مَنْ نَصَرَہٗ وَاخْذُلْ مَنْ
خَذَلَہٗ وَاَدِرِالْحَقَّ مَعَہٗ
حَیْثُ دَارَ۔"

"پروردگارا! اس کے دوستوں کو دوست
رکھ، اس کے دشمنوں سے دشمنی رکھ، جو اس
سے محبت کرے تو بھی اس سے محبت فرما
جو اس سے بغض رکھے تو اسے اپنا مبغوض
قرار دے جو اس کی مدد کرے تو اس کی مدد
فرما، اس کی امداد نہ کرنے والے کو تو اپنی امداد
سے محروم فرما اور حق کو اس کے ہمراہ چلا۔"

پھر فرمایا:
"تمام حاضرین کا فرض ہے کہ میرا یہ پیغام غائبین
تک پہنچا دیں۔"

ابھی لوگ اپنی جگہ سے اٹھنے نہ پائے تھے کہ جبرائیل امین یہ
آیت لے کر نازل ہوئے:

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ
وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ
وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔"

"آج کے دن میں نے تمھارے دین کو مکمل
کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر کامل کر دیں اور تمھارے
دین اسلام کو اپنے لیے پسند فرمایا۔"

اس موقع پر پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

"اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، عَلٰى
اِكْمَالِ الدِّيْنِ وَاِتْمَامِ
النِّعْمَةِ وَرِضَى الرَّبِّ بِرِسَالَتِيْ
وَالْوِلَايَةِ بِعَلِيٍّ مِنْ بَعْدِيْ۔"

"اللہ اکبر، اللہ اکبر، اس لیے کہ خدا نے اپنا
دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمتیں کامل کر دیں،
اور میری رسالت کے اور میرے بعد علیؑ کی
ولایت کے بارے میں اپنی رضامندی کا
اظہار فرما دیا۔"

اس دوران لوگوں کے درمیان شور و غل برپا ہو گیا اور سب لوگ علیؑ کو یہ عہدہ ملنے پر مبارکباد دینے لگے جن میں سے حضرات ابوبکر اور عمر بھی تھے جنھوں نے سب کے سامنے علیؑ کو ان الفاظ میں مبارکباد دی۔

"بَخٍّ بَخٍّ لَكَ يَا بْنَ اَبِيْ طَالِبٍ
اَصْبَحْتَ مَوْلَايَ وَمَوْلَا كُلِّ

مُؤْمِنٍ وَمُؤْمِنَۃٍ "

" مبارک ہو ، مبارک ہو آپ کو اے
فرزندِ ابوطالب آپؑ میرے اور ہر مومن مرد
اور عورت کے مولا ہو گئے ہیں ... "

مندرجہ بالا حدیث (من کنت .....) کو علمائے اسلام کی بہت بڑی تعداد نے مختلف عبارتوں کے ساتھ اپنی کتابوں میں درج کیا ہے ۔ البتہ کسی نے مکمل تفصیل کے ساتھ اور کسی نے مختصر طور پر ۔

اس حدیث کا شمار آنحضرتؐ کی متواتر احادیث میں ہوتا ہے جس سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں ہے ۔ حتیٰ کہ محقق بزرگوار اور دانشمند معظم " علامہ امینی مرحوم " نے اپنی مشہور کتاب " الغدیر " میں اس حدیث کو پیغمبرؐ کے ایک سو دس اصحاب اور تین سو ساٹھ مسلم علماء اور اسلامی کتابوں سے نقل کیا ہے اور اہل سنّت کی اکثر تفسیر ، تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں درج ہے ۔ حتیٰ کہ علمائے اسلام کی ایک بڑی تعداد نے اس بارے میں کئی مستقل کتابیں تحریر کی ہیں ۔ جن میں سے خود علامہ امینی مرحوم ہیں ۔ جنھوں نے اس موضوع پر نہایت ہی قیمتی اور بے نظیر کتاب الغدیر تحریر فرمائی ہے اور اسی کتاب میں ۲۶ ایسے علمائے کرام کا ذکر کیا ہے جنھوں نے " غدیر " کے موضوع پر مستقل کتابیں تحریر کی ہیں ۔

کچھ لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ حدیث کی سند سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا لہٰذا انھوں نے " حدیث کی دلالت " میں شکوک وشبہات پیدا کرنے شروع کر دیے اور مولا کے معنی " سرپرست اور رہبر " کی بجائے " دوست " بتانا شروع کر دیے حالانکہ اگر حدیث کے مضمون ، زمان اور مکان کے تقاضوں اور دوسرے قرائن پر غور

کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس سے مراد امت کی ہر طرح کی رہبری، پیشوائی، سرپرستی، امامت اور ولایت کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

الف : آیۂ تبلیغ جس کے بارے میں گزشتہ بحث میں تفصیل کے ساتھ بتا چکے ہیں، اس ماجرا کے واقع ہونے سے پہلے نازل ہوئی ہے اور آیت کے تیور اور قرائن بتا رہے ہیں کہ یہ حکم کسی معمولی قسم کی دوستی اور محبت کے بارے میں نہیں ہے کیونکہ اس کا اعلان کسی گھبراہٹ اور خطرے کا موجب نہیں تھا اور نہ ہی اس کے لیے اس قدر اہتمام کی ضرورت تھی۔

اسی طرح ماجرا کے بعد آیہ "اکمال دین" کا نازل ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یقیناً کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہوا ہے جو پیغمبرؐ کی جانشینی کے جیسے مسئلہ کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔

ب : اگر حدیث کے بیان کرنے کے زمان، مکان اور حالات کو مدنظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس قدر عظیم مقدمہ کے بعد، جلا دینے والی گرمی اور جھلسا دینے والے صحرا میں، ایک مفصل خطبے اور لوگوں سے پختہ اقرار لینے کے بعد حدیث بیان ہوئی ہے۔ جو ہمارے مدعا کی روشن دلیل ہے۔

ج : لوگوں کے مختلف گروہوں اور بڑی مقتدر" اسلامی شخصیتوں" کی طرف سے مبارکباد اور اسی موقع پر اور بعد میں شعراء کے اشعار، یہ سب اس بات کی دلیل ہیں کہ :

> وہاں پر علیؑ کا امام اور خلیفۂ رسولؐ کی حیثیت سے تعارف کرایا گیا تھا نہ کسی اور حیثیت سے۔

سوالات

(۱) داستانِ غدیر کو تفصیل کے ساتھ بیان کریں ؟

(۲) حدیثِ غدیر کو آنحضرتؐ سے کتنی سندوں کے ساتھ اور کس قدر اسلامی کتابوں میں نقل کیا گیا ہے ؟

(۳) حدیث غدیر میں" مولا " بمعنی رہبر اور امام ہے نہ کہ دوست ۔اس کی وجہ کیا ہے ؟

(۴) واقعہ غدیر کے بعد آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کے حق میں کیا دعا فرمائی ہے ؟

(۵) " غدیر" اور "جحفہ" کہاں پر واقع ہیں ؟

ساتواں سبق

حدیث "منزلت" اور "دعوتِ ذو العشیرۃ"

سورۂ اعراف کی آیہ ۱۴۲ کے ذیل میں اہلسنت اور بزرگ شیعہ علماء کی بہت بڑی تعداد نے حدیث منزلت کو ذکر کیا ہے۔

مذکورہ بالا آیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چالیس راتوں تک اپنے پروردگار کی میعادگاہ کو جانے اور ہارون علیہ السلام کو اس مدت میں اپنا جانشین بنانے کے بارے میں ہے۔

اسی طرح حدیث منزلت بھی اس وقت بیان ہوئی ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، علی علیہ السلام کو اپنا جانشین بنا کر جنگ تبوک کو جانے لگے تھے۔

تبوک، جزیرہ نمائے عرب کے شمالی حصہ پر واقع ہے اور اس زمانے میں سلطنتِ روم کی سرحد کے نزدیک تھا۔

آنحضرت کو بتایا گیا کہ بادشاہ روم نے حجاز، مکہ اور مدینہ پر چڑھائی کی غرض سے ایک عظیم لشکر تیار کر لیا ہے اور حجاز کی طرف آگے بڑھ رہا ہے تاکہ وہ آپ کے اسلامی انقلاب کو دوسرے ملکوں میں صادر ہونے سے روک دے۔

جب آنحضرتؐ کو اس بات کا یقین ہو گیا تو آپؐ نے بھی مکمل تیاری کر لی اور مدینہ منورہ میں علی ابن ابی طالبؑ کو اپنا جانشین مقرر کر کے تبوکؑ کی طرف جانے لگے تو حضرت علیؑ نے عرض کی کہ:

"آپ مجھے عورتوں اور بچّوں کے درمیان چھوڑ کر جا رہے ہیں اور کیا یہ اجازت نہیں دیں گے کہ میں آپؐ کے ساتھ مل کر میدان جنگ میں جانے کا شرف حاصل کروں؟"

تو آپؐ نے فرمایا:

"اَلَا تَرضیٰ اَن تَکُونَ مِنِّی بِمَنزِلَةِ هَارُونَ مِن مُوسیٰ اِلَّا اَنَّه لَیسَ نَبِیٌّ بَعدِی"

"آیا آپ اس بات پر راضی نہیں ہیں کہ آپ کی نسبت میرے ساتھ وہی ہو جو ہارونؑ کی موسیٰؑ کے ساتھ تھی؟ سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔"

مندرجہ بالا حدیث اہل سنت کی بخاری شریف اور مسلم شریف جیسی

معتبر کتابوں میں بھی ذکر ہو چکی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ

صحیح بخاری میں مکمل حدیث مذکور ہے اور صحیح مسلم میں ایک جگہ مکمل حدیث اور دوسری جگہ صرف

" اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰی اِلَّا اَنَّہٗ لَانَبِیَّ بَعْدِیْ "

کلی اور عمومی طور پر ذکر ہے [1]

اس کے علاوہ اہل سنت کی اور بھی بہت سی کتابوں میں یہ حدیث نقل ہو چکی ہے۔ جن میں سے " سنن ابن ماجہ "، " سنن ترمذی "، " مسند احمد " اور دوسری بہت سی کتابیں ہیں جن میں پیغمبر اکرم ؐ کے بیس سے زیادہ صحابیوں کی زبانی اس حدیث کو ذکر کیا گیا ہے جن میں سے جابر بن عبداللہ انصاری، ابوسعید خدری، عبداللہ بن مسعود اور معاویہ جیسے حضرات کے نام قابل ذکر ہیں۔

" ابوبکر بغدادی " نے اپنی کتاب " تاریخ بغداد " میں عمر بن خطاب سے اس طرح نقل کیا ہے :

" حضرت عمر نے ایک شخص کو دیکھا جو حضرت علیؑ کو ناسزا کہہ رہا تھا۔ تو انھوں نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم منافق ہو، کیونکہ میں نے پیغمبر اکرم ؐ کی زبانی سنا ہے :

اِنَّمَا عَلِیٌّ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ

---

[1] صحیح بخاری جز ۶ صفحہ ۳۔ اور صحیح مسلم جلد ا صفحہ ۴۴۔ جلد ۴ صفحہ ۱۸۷

مِنْ مُوْسٰی اِلَّا اَنَّہٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ"

"علیؑ کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو
موسیٰ سے تھی فرق صرف یہ ہے کہ میرے بعد کوئی
نبی نہیں آئے گا۔" [1]

اور پھر قابل غور بات یہ ہے کہ جب حدیث کی معتبر کتابوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے یہ حدیث فقط "جنگ تبوک" کے موقع پر ہی نہیں فرمائی بلکہ سات مختلف مقامات پر یہ ارشاد فرمایا ہے جو اس حکم کی عمومیت پر دلالت کرتی ہے۔

(۱) —— "یوم المواخات اول" کے موقع پر جبکہ آپؐ نے مکہ معظمہ میں اپنے اصحاب کے درمیان برادری قائم کی تو اپنے اور علیؑ کے درمیان برادری کا ناطہ قائم کیا اور اسی جملہ کو بیان فرمایا۔

(۲) —— "یوم المؤاخات دوم" کے موقع پر جب آنحضرتؐ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان برادری کا رشتہ قائم کیا تو اپنا برادری کا رشتہ علیؑ کے ساتھ قائم کیا۔ اور حدیث منزلت کو بیان فرمایا۔

(۳) —— جب آنحضرتؐ نے مسجد نبوی کی طرف کھلنے والے تمام دروازوں کو بند کرنے کا حکم دیا سوائے علی کے دروازے کے تو اس موقع پر بھی اسی جملہ کو تکرار کیا۔

(۴) —— جنگ تبوک کے موقع پر۔

---

[1] تاریخ بغداد۔ جلد ۷ صفحہ ۴۵۲

اس کے علاوہ تین اور مواقع ہیں جن کا ذکر اہلسنت کی معتبر کتابوں میں درج ہے۔

بنابریں نہ تو حدیث کی سند میں کسی قسم کے شک کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے اور نہ ہی حدیث کے مفہوم کی عمومیت میں!

حدیثِ منزلت کی افادیت

اگر تعصب کی عینک اتار کر مندرجہ بالا حدیث پر غور کیا جائے اور تحقیق کرنے سے پہلے فیصلہ دینے سے اجتناب کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت جناب ہارون علیہ السلام کو جو مراتب حاصل تھے، نبوت کے علاوہ وہی تمام مراتب علیؑ کو پیغمبر اسلامؐ کی نسبت حاصل تھے۔

کیونکہ حدیثِ بالا غیر مشروط واقع ہوئی ہے لہٰذا اس حدیث سے ہم مندرجہ ذیل نتائج اخذ کریں گے۔

- —— آنحضرتؐ کے بعد علی بن ابی طالب علیہ السلام تمام امت سے افضل ہیں (کیونکہ ہارونؑ اس فضیلت کے حامل تھے)
- —— علیؑ، آنحضرتؐ کے وزیر، ان کے معاون خصوصی اور قیادت و رہبری کے تمام پروگراموں میں ان کے شریک تھے (کیونکہ قرآن کی رو سے یہ تمام منصب حضرت ہارون کو حاصل تھے ملاحظہ ہو سورہ طٰہٰ آیت ۲۹ تا ۳۲)
- —— علیؑ، آنحضرتؐ کے جانشین اور خلیفہ تھے، ان کے ہوتے

ہوئے کوئی دوسرا شخص اس مقام کی اہلیت نہیں رکھتا جیسا کہ ھارونؑ کو موسیٰ علیہ السلام کی نسبت یہ مقام حاصل تھا۔

دعوتِ ذوالعشیرہ

مسلم مؤرخین کے مطابق بعثت کے تیسرے سال آنحضرتؐ کو حکم ہوا کہ اسلام کے بارے میں اپنی مخفی دعوت کو کھل کر بیان کریں اور اس کی کھلم کھلا تبلیغ کا آغاز کریں۔

چنانچہ سورۂ شعراء کی آیہ ۲۱۴ میں حکم ہے:

" وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ "

" اپنے نزدیکی رشتہ داروں کو ڈراؤ "

حکم پاکر آنحضرتؐ نے اپنے نزدیکی رشتہ داروں کو اپنے چچا جناب ابو طالبؑ کے گھر کھانے کی دعوت دی۔ جب سب کھانے سے فارغ ہوگئے تو آپؐ نے ان سے یوں خطاب فرمایا:

" اے فرزندان عبدالمطلب!
خدا کی قسم! مجھے تمام عرب میں کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا جو اپنی قوم کے لیے اس سے بہتر چیز لے کر آیا ہو، جو میں تمھارے لیے لے کر آیا ہوں۔ میں تمھارے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی لے کر

آیا ہوں۔ اور خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں
اس دین کی دعوت دوں جو میں اس کی طرف سے
لے کر آیا ہوں۔ تم میں سے کون ہے جو اس بارے
میں میری امداد کرے تاکہ میرا بھائی، وصی اور
جانشین ہو؟"

علیؑ کے سوا کسی نے بھی آپؐ کو مثبت جواب نہیں دیا۔ اس وقت وہ سب سے زیادہ کم سن تھے۔ کھڑے ہو کر یوں کہا:

"یا رسول اللہ! اس سلسلے میں، میں آپؐ کا
یاور اور مددگار ہوں گا۔"

آنحضرتؐ نے اپنا ہاتھ علیؑ کی گردن پر رکھا اور فرمایا:

"اِنَّ هٰذَا اَخِیْ وَوَصِیِّیْ وَخَلِیْفَتِیْ
فِیْکُمْ فَاسْمَعُوْا لَہٗ وَاَطِیْعُوْہُ۔"

"یہ میرا بھائی اور تمھارے درمیان میرا
وصی اور جانشین ہے۔ اس کی باتوں کو سننا
اور اس کے حکم کی اطاعت کرنا۔"

لیکن اس گمراہ قوم نے نہ صرف آپؐ کی دعوت کو قبول نہیں کیا، بلکہ آپؐ کا مذاق بھی اڑایا۔

مندرجہ بالا حدیث جو "حدیث یوم الدار" (گھر میں دعوت کے دن حدیث) کے نام سے مشہور ہے بہت حد تک ہمارے مدعا کے ثبوت کے لیے کافی ہے اور سند کے لحاظ سے بھی اہل سنت کے بہت سے علماء نے

اس کو ذکر کیا ہے۔ جن میں سے ابن ابی جریر ——— ابن ابی حاتم ——— ابن مردویہ ——— حافظ ابونعیم ——— بیہقی ——— ثعلبی ——— طبری ——— ابن ابی اثیر ——— ابوالفدار اور بہت سے دوسرے علمار کرام کے نام قابلِ ذکر ہیں [1]

جب ہم مندرجہ بالا حدیث کو غور سے دیکھتے ہیں اور اس کے حقائق معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث نے علیؑ کی ولایت اور خلافت بلا فصل کو بڑی صراحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

سوالات

1. "حدیثِ منزلت" کیا ہے ؟ اور کتنے مقامات پر بیان ہوئی ہے ؟
2. "حدیثِ منزلت" کی افادیت بیان کریں اور بتائیں کہ اس سے علیؑ کے کیا کیا مراتب ثابت ہوتے ہیں ؟

---

[1] مزید معلومات کے لیے کتاب " المراجعات " صفحہ ۱۳۰ اور اس کے بعد اور کتاب " احقاق الحق " جلد ۴ صفحہ ۶۲ کے بعد ملاحظہ فرمائیں۔

۳ — نص قرآن کی رو سے ہارونؑ کو موسیٰؑ کی نسبت کیا منزلت حاصل تھی ؟

۴ — "حدیث منزلت" کو کن علما نے ذکر کیا ہے ؟

۵ — دعوت ذوالعشیرہ کب اور کہاں دی گئی ؟ اس کی سند اور نتیجے کو بھی بیان کریں ؟

آٹھواں سبق

حدیثِ "ثقلین" اور حدیثِ "سفینۂ نوحؑ"

حدیثِ ثقلین اور اس کی سند

شیعہ اور سُنّی علماء کے درمیان مشہور احادیث میں سے ایک "حدیثِ ثقلین" ہے۔

اس حدیث کو آنحضرتؐ کے صحابہ کرام کے ایک عظیم گروہ نے بلا واسطہ طور پر سرورِ کائنات کی زبانی بیان کیا ہے۔ بلکہ بعض بزرگ محدثین نے اصحاب کرام کی تعداد تیس سے زیادہ بیان کی ہے۔ [1]

مفسرین، محدثین اور مورخین کی بہت بڑی تعداد نے اس حدیث کو

---

[1] سیرت حلبی جلد ۳۳ - صفحہ ۳۰۸

اپنی کتابوں میں درج کیا ہے جس کی وجہ سے حدیث کے تواتر میں کسی قسم کا شک نہیں کیا جا سکتا۔

عالم بزرگوار سید ہاشم بحرانی نے کتاب " غایۃ المرام " میں اس حدیث کو علمائے اہل سنّت کی ۳۹ سندوں کے ساتھ اور علمائے تشیع کی ۸۰ اسناد کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

اور عالم بزرگوار میر حامد حسین ہندی نے اس سلسلے میں مزید تحقیق کے ساتھ کام لیا ہے اور تقریباً ۲۰۰ علمائے اہلسنت کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور اس بارے میں کی جانے والی اپنی تحقیقات کو اپنی عظیم کتاب (عبقات الانوار) کی چھ جلدوں میں جمع کیا ہے۔

اصل حدیث حضرت ابوذر غفاری کی زبانی یوں بیان ہوئی ہے۔
وہ خانہ کعبہ کو پکڑ کر لوگوں کی طرف منہ کر کے یوں کہہ رہے تھے:

" لوگو! میں نے پیغمبر اکرمؐ کی زبانی سنا ہے کہ

" اِنِّیْ تَارِكٌ فِیْكُمُ الثَّقَلَیْنِ:
كِتَابَ اللهِ وَعِتْرَتِیْ۔ وَاِنَّهُمَا
لَنْ یَّفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ
الْحَوْضَ "

" میں تمھارے درمیان دو گرانقدر چیزیں
چھوڑے جا رہا ہوں۔ ایک کتاب خدا (قرآن)
ہے اور دوسری میری عترت (اہلبیت) ہیں

اور جب تک یہ دونوں مجھ تک حوض کوثر پر نہ پہنچ
جائیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔ پس
تم اس بات کا خیال رکھنا کہ میری اس وصیت کو
ان کے بارے میں کس حد تک پورا کرو گے؟"[۱]

قابل غور بات یہ ہے کہ مختلف اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے
کہ اس حدیث کو آنحضرتؐ نے مختلف مواقع پر لوگوں کے سامنے بیان کیا ہے
چنانچہ:

- —— جابر بن عبداللہ انصاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے یہ حدیث سفر حج کے دوران عرفہ کے دن بیان فرمائی۔
- —— عبداللہ بن حنطب کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث آپؐ نے "جحفہ" کے مقام پر (مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ ہے جہاں سے بعض حاجی احرام باندھتے ہیں) بیان فرمائی۔
- —— حضرت ام سلمہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے یہ حدیث "غدیر خم" کے مقام پر ارشاد فرمائی۔
- —— بہت سی روایات میں آیا ہے کہ آپؐ نے یہ حدیث اپنی زندگی کے آخری ایام میں بستر مرض پر بیان فرمائی۔
- —— بعض روایات میں ملتا ہے کہ آپ نے اسے مدینہ میں

---

[۱] نقل از جامع ترمذی منقول از ینابیع المودۃ صفحہ ۳۷

منبر پر بیان فرمایا۔[۱]

حتیٰ کہ اہلسنت کے مشہور دانشمند اور عالم "علامہ ابن حجر مکی" نے اپنی کتاب " صواعق محرقہ " میں اس روایت کو آنحضرتؐ سے یوں نقل کیا ہے کہ :

" پیغمبر اسلام نے یہ حدیث بیان فرمانے کے بعد علیؑ کا ہاتھ بلند کر کے فرمایا :

" یہ علیؑ قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علیؑ کے ساتھ اور یہ جب تک حوض کوثر پر مجھ تک نہ پہنچ جائیں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہیں ہوں "۔ [۲]

مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ اس مسئلہ (خلافت) کو نہایت ہی اہمیت دیتے تھے اور مناسب موقع پر اس کا اظہار فرماتے رہتے تھے تاکہ لوگ اس مسئلہ کی اہمیت کو فراموش نہ کر دیں۔

حدیث ثقلین کی افادیت

اس مقام پر چند ایک نکتے قابل توجہ ہیں :

● —— "قرآن" اور "عترت" کا " دو گرانقدر چیزوں" کے عنوان سے تعارف اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں پر لازم ہے کہ ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رکھیں۔

۱۔ المراجعات صفحہ ۲۴

۲۔ صواعق المحرقہ صفحہ ۷۵

اور خصوصاً جیسا کہ بہت سی روایات میں یہ جملہ بھی ہے کہ " اگر ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو ہرگز گمراہ نہیں ہوگے " اس مسئلہ کی اہمیت کو مزید واضح کرتا ہے۔

- —— " قرآن " کو " عترت " کے اور " عترت " کو " قرآن " کے ہم پلّہ قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ جس طرح قرآن مجید ہر قسم کی تحریف سے محفوظ اور ہر طرح کی خطا سے مصئون ہے۔ اسی طرح " عترت اہلبیت " بھی ہر قسم کی خطا و گناہ سے معصوم اور عصمت کے درجے پر فائز ہیں۔
- —— بعض روایات میں اس بات کی تصریح بھی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: میں قیامت کے دن تم سے ان دونوں کے بارے میں سوال کروں گا کہ ان دونوں کے ساتھ تمھارا طرز عمل کیا رہا ہے ؟
- —— " عترت و اہلبیت " کی جو بھی تفسیر کی جائے علی بن ابی طالبؑ اس کا روشن مصداق ہیں اور متعدد روایات کی رو سے نہ تو وہ کبھی قرآن سے جدا ہوں گے اور نہ ہی قرآن کبھی ان سے جدا ہوگا۔

علاوہ بریں متعدد روایات کی بنا پر جب " آیہ مباھلہ " نازل ہوئی تو آنحضرتؐ نے علی ، فاطمہ ، حسن اور حسین علیہم السلام کو بلا کر فرمایا: " یہی میرے اہل بیت ہیں " ۔ [۱]

---

[۱] مشکوٰۃ المصابیح صفحہ ۵۶۸ مطبوعہ دہلی - ریاض النضرہ جلد ۲ صفحہ ۲۴۸ (منقول از مسلم و ترمذی)

● —— اگرچہ قیامت کے دن سے متعلق مسائل ہم لوگوں کو (جو اس دنیا کی چار دیواری میں محصور ہیں) اچھی طرح معلوم نہیں ہیں لیکن جہاں تک بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے "حوضِ کوثر" سے مراد بہشت میں ایک مخصوص نہر ہے جو خاص مومنین، پیامبر اسلامؐ ائمہ اطہارؑ اور ان کے پیرو کاروں کے لیے مختص ہے۔

خلاصہ کلام ان تمام تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد امتِ اسلامی کے مرجع اور مسلمانان عالم کے رہبر علی ابن ابی طالبؑ اور ان کے بعد ان کی اولاد سے ہونے والے امامؑ ہیں

حدیثِ سفینۂ نوحؑ

ان عمدہ تعبیرات میں سے ایک تعبیر جو شیعہ اور اہلِ سنت کی معتبر کتابوں میں بیان کی گئی آنحضرت کی وہ تعبیر ہے جسے حضرت ابوذر غفاریؓ نے بیان کیا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ:

"میں نے آنحضرتؐ سے سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا ہے:

اَلَا اِنَّ مَثَلَ اَهْلِ بَيْتِىْ

فِيْكُمْ مَثَلُ سَفِيْنَةِ نُوْحٍ ،

مَنْ رَكِبَهَا نَجٰى وَمَنْ تَخَلَّفَ
عَنْهَا غَرَقَ "

" میرے اہلبیت کی مثال کشتئ نوحؑ کی سی ہے
جس نے اس سے استفادہ کیا نجات پا گیا اور
جو اس سے دُور رہا غرق ہو گیا۔ " [1]

یہ حدیث بھی جو مشہور احادیث میں سے ہے لوگوں کو بعد پیغمبرؐ، علیؑ اور اہلبیت عصمت وطہارت کی اتباع کا حکم دے رہی ہے۔

چونکہ حضرت نوحؑ کے زمانے میں عظیم اور عالمگیر طوفان کے وقت نجات کا ذریعہ صرف اور صرف کشتئ نوحؑ تھی۔ لہٰذا پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے بعد امتِ مسلمہ پر جو طوفان حوادث آئے اور آتے رہیں گے ان میں بھی نجات کا تنہا ذریعہ ولا را ہلبیت کے ساتھ تمسک ہی ہے۔

---

[1] مستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۱۵۱

سوالات

۱۔ "حدیثِ ثقلین" کی کیا افادیت ہے؟ اور اہلبیتؑ کے لیے کس اہمیت کو واضح کرتی ہے؟

۲۔ "حدیث ثقلین" کو کن لوگوں نے نقل کیا ہے؟

۳۔ اس حدیث کو آنحضرتؐ نے کن کن مواقع پر بیان فرمایا ہے؟

۴۔ "حدیثِ سفینہ نوح" کی سند اور مطالب بیان کریں؟

نواں سبق

بارہ امام

بارہ اماموں سے متعلق روایت

امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی امامت اور خلافتِ بلا فصل کے ثابت ہوجانے کے بعد اب باقی ائمہؑ کی امامت کی بات ہوگی۔ اور اس بحث کو مختصر الفاظ میں ہم یوں بیان کریں گے :

اولاً : اس وقت اہل سنّت اور شیعوں کی متعدد کتابیں ہمارے پاس موجود ہیں جن میں "پیغمبرؐ کے بعد بارہ ائمہ اور خلفار کی خلافت" کا ذکر موجود ہے۔

اس قسم کی احادیث اہلسنّت کی نہایت ہی مشہور کتابوں میں موجود ہیں جن میں سے صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ترمذی، سنن ابی داودؒ اور

مسند احمد جیسی کتابیں قابلِ ذکر ہیں۔

کتاب "منتخب الاثر" میں ۲۷۱ دو سو اکہتر احادیث نقل کی گئی ہیں جن میں سے بہت بڑی تعداد اہل سنّت کی کتابوں سے نقل کی گئی ہے۔

مثال کے طور پر اہل سنت کی مشہور ترین کتاب صحیح بخاری میں ہے:

"جابر بن سمرہ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرتؐ کو فرماتے سنا ہے کہ:

"یَکُوْنُ اِثْنَا عَشَرَ اَمِیْرًا۔
فَقَالَ کَلِمَةً لَمْ اَسْمَعْهَا۔
فَقَالَ اَبِی اِنَّهٗ قَالَ کُلُّهُمْ مِنْ قُرَیْشٍ۔"

بارہ حکمران ہوں گے۔ پھر آپؐ نے کچھ کہا جسے میں نہیں سن سکا۔ میرے والد نے کہا کہ حضورؐ نے فرمایا کہ سب کے سب قریش سے ہوں گے۔"[۱]

صحیح مسلم میں اس حدیث کو یوں نقل کیا گیا ہے کہ:

"جابر کہتے ہیں۔ میں نے آنحضرتؐ سے سنا، آپ نے فرمایا:

---

[۱] صحیح بخاری صفحہ ۱۰۰

لَا يَزَالُ الْإِسْلَامُ عَزِيْزاً إِلىٰ
اِثْنَا عَشَرَ خَلِيْفَةً ۔ ثُمَّ قَالَ
كَلِمَةً لَمْ أَسْمَعْهَا ۔ فَقُلْتُ
لِأَبِيْ مَا قَالَ ۔ قَالَ فَقَالَ
كُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ "

" میرے بارہ خلیفوں اور جانشینوں تک
اسلام کو ہمیشہ برتری حاصل رہے گی۔
پھر آپؐ نے ایسی بات کی جسے میں نہیں سمجھ سکا
اور اپنے والد سے پوچھا کہ آپؐ نے کیا فرمایا؟
میرے والد نے کہا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ سب
کے سب خلفار قریش سے ہوں گے۔" [۱]

"مسند احمد میں پیغمبرؐ کے مشہور صحابی عبداللہ بن مسعود سے مروی
ہے کہ:

" آنحضرتؐ سے ان کے خلفار کے بارے میں سوال
کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا:
" اِثْنَا عَشَرَ كَعِدَّةِ نُقَبَاءِ بَنِيْ

---

[۱] صحیح مسلم کتاب الامارہ باب الناس تبع لقریش

اسـرائیل"
نقبار بنی اسرائیل کی تعداد کے برابر بارہ خلفار
ہوں گے۔" [۱]

ان احادیث کی افادیت

یہ احادیث کہ جن میں سے کچھ میں اسلام کی عزت اور برتری کو ان بارہ خلفار کا مرہون قرار دیا گیا ہے اور بعض میں قیامت تک دین کی حیات اور بقار کو ان جانشینوں کا مرہون منت بتایا گیا ہے اور سب خلفار کو "قریش" سے بتایا گیا ہے بلکہ بعض احادیث میں "بنی ہاشم" سے ان کا تعارف کرایا گیا ہے کسی بھی اسلامی مکتب فکر کے ساتھ مطابقت نہیں کرتیں سوائے مذہب اہلبیت شیعہ اثنا عشریہ کے۔ کیونکہ ان کا مصداق صرف مذہب شیعہ میں ملتا ہے۔ جبکہ علمار اہل سنت ان احادیث کی توجیہ میں مختلف تاویلیں کرتے ہیں جو کسی بھی صورت میں متن احادیث کے ساتھ مطابقت نہیں کرتیں کہ آیا خلفار سے مراد پہلے چار خلفار اور بنی امیہ اور بنی عباس کے خلیفہ ہیں؟

حالانکہ نہ پہلے خلفار (راشدین) کی تعداد بارہ تھی اور نہ ہی بنی امیہ اور بنی عباس کے خلفار کو ملا کر ان کی تعداد بارہ ۱۲ ہوتی ہے۔

اور پھر یہ کہ ان (اموی اور عباسی) خلفا میں یزید، منصور دوانیقی اور ہارون الرشید ایسے لوگ بھی ہو گزرے ہیں جو ننگ دین وملت ننگ انسانیت اور ظلم واستکبار اور جرائم کا مجسم نمونہ تھے اور کسی بھی صورت

---

[۱] مسند احمد جلد ۱ صفحہ ۳۹۸

میں پیغمبر کے " خلیفہ" کہلانے کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ اور نہ ہی ان سے اسلام کو عزت اور سربلندی ملتی ہے اور خلافت کے معیار کو جس قدر بھی سادہ بتائیں پھر بھی وہ اس پر پورے نہیں اُترتے۔

ان سب سے قطع نظر بارہ کی تعداد صرف ائمۂ اہلبیت پر ہی صادق آتی ہے۔

بارہ امام اور ان کے نام

قابل غور بات یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی بہت سی روایات میں جو اہلسنت کے ذرائع سے ہم تک پہنچی ہیں بارہ اماموں کا نام صراحت کے ساتھ ان کی صفات سمیت ذکر ہوا ہے۔

اہل سنت کے مشہور عالم دین شیخ سلیمان حنفی قندوزی نے اپنی کتاب ینابیع المودہ میں لکھا ہے کہ :

> " نعثل " نامی ایک یہودی آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے دوسرے سوالات کے دوران میں آپؐ کے جانشینوں اور اوصیاء کے بارے میں سوال کیا تو آپؐ نے یوں فرمایا :
>
> " اِنَّ وَصِيِّىْ عَلِىِّ بْنُ اَبِىْ طَالِبٍ وَبَعْدَهٗ سِبْطَایَ الْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ يَتْلُوْهُ تِسْعَةُ اَئِمَّةٍ مِنْ صُلْبِ

الْحُسَيْنِ۔

قَالَ يَا مُحَمَّدُ فَسَمِّهِمْ لِيْ:

قَالَ (ص) اِذَا مَضٰی الْحُسَيْنُ فَابْنُهٗ عَلِيٌّ، فَاِذَا مَضٰی عَلِيٌّ فَابْنُهٗ مُحَمَّدٌ فَاِذَا مَضٰی مُحَمَّدٌ فَابْنُهٗ جَعْفَرٌ فَاِذَا مَضٰی جَعْفَرٌ فَابْنُهٗ مُوْسٰی فَاِذَا مَضٰی مُوْسٰی فَابْنُهٗ عَلِيٌّ فَاِذَا مَضٰی عَلِيٌّ فَابْنُهٗ مُحَمَّدٌ فَاِذَا مَضٰی مُحَمَّدٌ فَابْنُهٗ عَلِيٌّ فَاِذَا مَضٰی عَلِيٌّ فَابْنُهٗ الْحَسَنُ فَاِذَا مَضٰی الْحَسَنُ فَابْنُهٗ الْحُجَّةُ مُحَمَّدُ اِلْمَهْدِيُّ (ع) فَهٰؤُلَاءِ اِثْنَا عَشَرَ "

" میرے وصی علی بن ابی طالب ہیں اور

ان کے بعد میرے دو فرزند حسنؑ اور حسینؑ ہیں اور
حسینؑ کے بعد ان کی اولاد سے نو امام ہوں گے۔"
یہودی نے ان کے نام دریافت کیے :
آنحضرتؐ نے فرمایا : جب حسینؑ اس دنیا سے
چلے جائیں گے تو ان کے فرزند علیؑ ہوں گے اور
علیؑ کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد ان کے
بیٹے محمدؑ ہوں گے ، محمدؑ کے بعد ان کے فرزند
جعفرؑ ہوں گے ، ان کے اس دنیا سے چلے جانے
کے بعد ان کے فرزند موسیٰؑ ہوں گے ، موسیٰؑ جب
اس دنیا سے چلے جائیں گے تو ان کے بیٹے علیؑ ہوں گے
علیؑ کے بعد ان کے فرزند محمدؑ ہوں گے ۔ محمدؑ کے بعد
ان کے بیٹے علی ہوں گے ، علیؑ کے اس دنیا سے
چلے جانے کے بعد ان کے فرزند حسنؑ ہوں گے جب
حسنؑ اس دنیا سے چلے جائیں گے تو ان کے فرزند
حجت (خدا) محمدؑ مہدی ہوں گے تو یہ ہیں بارہ امام"[1]

اور اسی کتاب (ینابیع المودۃ) میں "کتاب مناقب" سے ایک حدیث پیغمبرؐ نقل کی گئی ہے جس میں بارہ اماموں کے نام اور لقب بھی بیان کیے گئے ہیں اور امام مہدی علیہ السلام کے بارے میں ، ان کی غیبت ، ان کا ظہور ، ان کا زمین کو عدل و انصاف سے پُر کرنے کا تذکرہ بھی موجود ہے[2]

---

[1] ینابیع المودۃ صفحہ ۴۴۱ [2] ینابیع المودۃ صفحہ ۴۴۲

البتہ شیعی ذرائع سے بیان ہونے والی احادیث اس بارے میں اس قدر زیادہ ہیں کہ "حد تواتر" سے بڑھ جاتی ہیں۔

جو کوئی مر جائے اور اپنے زمانہ کے امام کو نہ پہچانے.....

اور پھر قابل غور آنحضرتؐ کی ایک حدیث ہے جسے اہلسنت کی کتابوں میں بھی نقل کیا گیا ہے۔

آپ فرماتے ہیں:

" مَنْ مَاتَ بِغَيْرِ اِمَامٍ مَاتَ مِيْتَةً الْجَاهِلِيَّةِ "

"جو شخص امام کے بغیر مر جائے تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا" [1]

اور یہی حدیث شیعوں کی کتابوں میں اس طرح وارد ہوئی ہے:

" مَنْ مَاتَ وَلَا يَعْرِفُ اِمَامَهُ مَاتَ مِيْتَةَ الْجَاهِلِيَّةِ "

"جو شخص امام زمانہ کی پہچان کے بغیر مر جائے تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔" [2]

---

[1] المعجم المفہرس لالفاظ الاحادیث النبوی جلد ۶ صفحہ ۳۰۲

[2] بحار الانوار جلد ۶ (طبع قدیم) صفحہ ۱۶

اس حدیث سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ ہر دور اور زمانے میں ایک نہ ایک امامِ معصوم کا ہونا ضروری ہے اور اس کی معرفت بھی ہر مسلمان پر واجب ہے۔ اور اسے نہ پہچاننا اس قدر نقصان دہ ہے کہ انسان کو کفر اور جاہلیت کی سرحد تک پہنچا دیتا ہے۔

تو کیا امام اور پیشوا سے مُراد چنگیز اور یزید جیسے حکام وقت ہیں یا بڑی طاقتوں کے زیرِ اثر پٹھو حکام ؟

ظاہر ہے کہ جواب نفی میں ہوگا۔ کیونکہ اکثر اوقات ایسے لوگ برسرِ اقتدار رہے ہیں جو غدّار، خیانت پیشہ، ظالم اور جابر تھے ؛

یا پھر کسی نہ کسی بڑی غیر مسلم طاقت کے زیرِ اثر مشرقی یا مغربی بلاک سے وابستہ، اور ان کے آلۂ کار۔

لہٰذا اگر ان کو امام یا رہبر کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے تو ان کی امامت سیدھا جہنم بھیج دے گی۔

لہٰذا ہر زمانے میں کسی نہ کسی معصوم امام کا ہونا ضروری ہے جس کو پہچاننا اور اس کی اطاعت کرنا ہر مسلمان کا فرض بنتا ہے۔

مندرجہ بالا دلائل کے علاوہ ہر امامؑ کے بارے میں " نصّ " اور روایات بھی موجود ہیں اور اس دنیا سے جانے وقت ہر امامؑ نے اپنے جانشین کی بابت صراحت کے ساتھ اس کی امامت اور پیشوائی کا اعلان کیا ہے۔ نیز ہر امام نے بوقت ضرورت معجزہ کے ذریعہ بھی اپنی امامت کی صداقت کو دنیا سے تسلیم کرایا ہے۔

؟ سوالات

① بارہ[۱۲] اماموں سے متعلق روایات کن کتابوں میں آئی ہیں؟

② ان احادیث کا کیا مفہوم ہے ؟

③ آیا اہل سنّت کی کتابوں میں بارہ اماموں کے نام موجود ہیں ؟

دسواں سبق

حضرت امام مہدیؑ

بارہواں پیشوا اور عظیم عالمی مصلح

۱۔ تاریک رات کا انجام، صبح کی سفیدی ہے:

جب ہم موجودہ حالات پر نگاہ ڈالتے ہیں اور جرائم، قتل و غارت، جنگ و جدال، لڑائی اور خونریزی، بین الاقوامی کشمکش، اختلافات اور اخلاقی انحطاط کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔ پھر ہم اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں کہ

آیا حالات اسی طرح آگے بڑھتے جائیں گے؟

اور جرائم اور فسادات میں اس قدر وسعت آجائے گی کہ وہ

جہانِ بشریت کو ایک دائمی جنگ کی بھٹی میں جھونک دیں گے ؟

اور انسانیت عقائد کی گمراہی اور اخلاق کی پستی کے دلدل میں پھنس کر ہمیشہ کے لیے تباہ و برباد ہو جائے گی ،

یا نہیں ــــــــ ؟

نجات اور اصلاح کی بھی کوئی امید نظر آتی ہے ؟

اس اہم سوال کے دو جواب ہیں :

پہلا جواب:

تو ان لوگوں کی طرف سے ہے جو ہمیشہ بدظنی کا شکار رہے ہیں اور یا مادہ پرست ہیں وہ کہتے ہیں کہ :

انسانیت کا مستقبل نہایت تاریک ہے اور کشتیٔ انسانیت روز بروز فتنہ و فساد کے گرداب میں پھنستی چلی جائے گی اور نجات کی کوئی امید نہیں ہے ۔

دوسرا جواب:

ان لوگوں کی طرف سے ہے جو کسی دین کے پیرو کار ہیں ۔ خاص طور پر مسلمان اور خصوصاً شیعیان عالم ۔ وہ کہتے ہیں کہ :

یہ تاریک بادل ، یہ طوفان حوادث ، یہ تباہ کن سیلاب ، ایک نہ ایک دن ختم ہو جائیں گے ۔ مطلع صاف ہو جائے گا جس سے آفتاب بخوبی روشن ہوگا اور معاشرے کو سکون کا سانس لینے کا موقع ملے گا ۔

یہ خطرناک اور مہیب گرداب ہمیشہ نہیں رہیں گے افق پر سے عنقریب ساحل نجات دکھائی دینے والا ہے ۔

اس عالم کو ایک عظیم مصلح کا انتظار ہے جو ایک انقلاب سے
دنیا کی کایا پلٹ دے گا اور عالم انسانیت کو حق اور عدالت کی
طرف لوٹا دے گا۔

البتہ مختلف ادیان کے پیروکار" اس عظیم مصلح "کو مختلف ناموں سے
موسوم کرتے ہیں لیکن ان کا قبلہ مقصود صرف ایک ہی ذات ہے۔ عرب شاعر کے
قول کے مطابق :

عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ
وَكُلٌّ اِلٰی ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيْرُ

ہماری عبارتیں مختلف ہیں لیکن تمہارا حسن ایک ہی ہے
اور ہماری سب گفتار تمہارے ایک حسن وجمال کی طرف
اشارہ ہے ۔

۲۔ عظیم مُصلح کا ظہور فطری ہے

باطنی الہامات جو کبھی کبھی عقل کے فیصلوں پر بھی غالب آجاتے ہیں نہ صرف
خدا کی شناخت کے سلسلے میں راہنمائی کرتے ہیں بلکہ تمام مذہبی عقائد میں انسان کی
راہنمائی کرتے ہیں ۔

یہ الہامات اس مسئلہ میں بھی ہماری راہنمائی کر رہے ہیں اور
اس کی مندرجہ ذیل علامات ہیں :

پہلی علامت یہ ہے کہ :

بغیر کسی استثناء کے دنیا کے تمام لوگ مختلف صورتوں میں
باہمی اختلاف رکھنے کے باوجود اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا پر صلح و آشتی کا عمل

کارفرما ہو اور عدالت کا دور دورہ ہو۔ وہ اس بات کو عشق کی حد تک چاہتے ہیں۔ سب لوگ اس چیز کا نعرہ لگاتے ہیں۔ عدالت کے برقرار کرنے کے لیے اپنے تمام وجود سے اس کی کوشش کرتے ہیں۔

اور یہی چیز اس بات کی فطری دلیل ہے کہ صلح و عدالت کے برقرار کرنے کے لیے ایک عظیم مصلح کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہر جگہ اور ہر شخص کی طرف سے اس بات کا اظہار اس کے فطری ہونے کی دلیل نہیں تو اور کیا ہے؟

ہر صحیح اور فطری عشق اس بات کی دلیل ہے کہ معشوق کا وجود خارج میں ہے جو کہ اپنے عاشق کو اپنی طرف جذب کر رہا ہے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خداوند عالم اس "پیاس" کو انسان کے وجود میں تو پیدا کر دے لیکن اس پیاس کو بجھانے کے لیے خارج میں "چشمۂ زلال" پیدا نہ کرے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ انسان کا عدالت طلب ضمیر اور پاک فطرت آواز دیکر کہہ رہے ہیں کہ یقیناً ایک مصلح ضرور آئے گا اور صلح و آشتی اور عدل و انصاف کا دنیا پر دور دورہ ہوگا اور ظلم و ستم اور خود غرضی کا خاتمہ ہو کر رہے گا اور انسانیت ایک ملک کی صورت میں ایک پرچم تلے صدق و صفا کی زندگی بسر کرے گی۔

دوسری علامت یہ ہے کہ:

تمام ادیان و مذاہب کے پیروکار ایک عظیم عالمی مصلح کے انتظار میں ہیں اور ان سب کا انتظار یکساں ہے۔ اور تقریباً تمام ادیان نے اس بارے میں ایک فصل مختص کی ہوئی ہے۔

اور عالم بشریت کے زخموں کے مرہم کے لیے ایک عظیم نجات دہندہ کے ظہور پر ایمان کا مسئلہ صرف مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ایسے ثبوت بھی

ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ایک عمومی عقیدہ ہے اور قدیم الایام سے چلا آرہا ہے اور مشرق و مغرب کی تمام اقوام اور مذاہب اسی عقیدے کے پابند چلے آرہے ہیں البتہ مذہبی نکتہ نظر سے اسلام نے اس عقیدہ پر خاص توجہ دی ہے۔

زردشتیوں کی مشہور کتاب " زند " میں اہرمین اور یزدان کے پیرو کاروں کے درمیان جنگ وجدال کے ذکر کے بعد لکھا ہے کہ

" اس وقت کامیابی یزدان کے پیرو کاروں کو ہوگی
اور اہرمین کے پیرو کار تباہ ہو جائیں گے ....
...... یہ دنیا اپنی حقیقی سعادت کو پالے گی اور
بنی آدم نیک بختی کے تخت پر جا بیٹھیں گے ۔"

" زردشت " کی کتاب " جاماسب نامہ " کے یہ الفاظ ہیں :

" عربوں کی سرزمین سے ایک مرد ظاہر ہوگا.......
... باعظمت سردار .... جسیم اور مضبوط ٹانگوں
والا ہوگا۔ اپنے جد کے دین پر اور بہت بڑا
لشکر لے کر ظاہر ہوگا .... اور زمین کو
عدل وانصاف سے بھر دے گا۔"

ہندوؤں کی کتاب " وشن جوگ " میں ہے کہ :

" انجام کار یہ دنیا ایک ایسے شخص کی طرف لوٹ
جائے گی جو خدا کو دوست رکھتا ہوگا اور خدا کے
خاص بندوں میں سے ہوگا۔"

ہندوؤں کی ایک اور کتاب " باسک " میں ہے :

" آخری زمانے میں دنیا کا دور ایک عادل بادشاہ پر

ختم ہو جائے گا ، وہ فرشتوں ، پریوں اور
انسانوں کا پیشوا ہو گا ۔ صحیح معنوں میں حق اس
کے ساتھ ہو گا ۔ جو کچھ سمندروں ، دریاؤں ،
زمینوں اور پہاڑوں کے اندر پوشیدہ ہو گا
ان سب کو نکال لے گا ۔ زمین اور آسمان کی
خبریں دے گا ۔ اس وقت دنیا میں اس سے
اور کوئی بڑا آدمی نہیں ہو گا ۔

" عہد قدیم " کی (تورات اور اس کے ملحقات سے) ایک کتاب " مزامیر "
میں ہے :

" شریر لوگوں کا خاتمہ ہو جائے گا ۔ خدا پر توکل کرنے
والے لوگ زمین کے وارث ہوں گے ۔"

اسی کتاب اور اسی فصل میں آگے چل کر کہا گیا ہے :

" صدیق (سچے) لوگ زمین کے وارث ہوں گے ۔
اور اس میں ہمیشہ رہیں گے ۔"

اسی طرح کے کلمات تورات کی کتابوں میں سے کتاب " اشعیای نبی "
میں بھی مذکور ہیں ۔

" متی کی انجیل " فصل ۲۴ میں یوں درج ہے :

" جس طرح بجلی مشرق سے چمکتی ہے تو اس کی روشنی
مغرب کو بھی منور کر دیتی ہے ۔ انسان کا بیٹا بھی اسی
طرح ظاہر ہو گا ...... "

" لوقا کی انجیل " فصل ۱۲ میں یہ کلمات درج ہیں :

"اپنی کمروں کو باندھے رکھو اور اپنے چراغوں کو ہمیشہ جلائے رکھو، ایسے لوگوں کی مانند ہمیشہ چوکس رہو جو اپنے آقا کی آمد کے منتظر ہوتے ہیں تاکہ جب بھی وہ دروازہ کھٹکھٹائے تو اس کے لیے فوراً کھول دیں۔"

کتاب "علائم الظہور" میں اس طرح آیا ہے:

"چینیوں کی قدیم کتابوں میں، ہندوؤں کے عقائد میں اور اسکنڈے نیویا کے رہنے والوں بلکہ قدیم مصریوں اور میکسیکو کے رہنے والوں اور اس طرح کے دوسرے لوگوں کے درمیان "ایک عالمی مصلح کے ظہور کا عقیدہ" پایا جاتا ہے۔

۳۔ عقلی دلائل

الف: کائنات کا نظام ہمیں یہ درس دیتا ہے کہ عالمِ بشریت کو آخرکار قانونِ عدالت کے سامنے سر جھکانا ہوگا اور ایک منصفانہ نظام اور حقیقی مصلح کے آگے ہتھیار ڈالنے ہوں گے۔

تفصیل:

جہاں تک ہم جانتے ہیں یہ عالمِ ہستی کئی نظاموں کا مجموعہ ہے۔ اس تمام جہان میں منظم قوانین کا ہونا اس کی یک جہتی اور یکسانیت کی علامت ہے۔ نظم و قانون اور حساب و کتاب اس جہان کے اہم ترین اور بنیادی مسائل ہیں جن پر دنیا کا نظام صحیح صورت میں چل رہا ہے۔ عظیم منظومۂ شمسی سے لے کر ایک

ایٹمی ذرّے تک (جو کئی لاکھ کی تعداد میں ایک سوئی کی نوک پر اکٹھے ہو سکتے ہیں) سب کے سب ایک سوچے سمجھے نظام کے تحت چل رہے ہیں۔

ہمارے بدن کے مختلف حصے، ایک چھوٹے سے خلیے سے لیکر دماغ کے طریقہ کار، اعصاب کے سلسلے، دل اور جگر کے جیسے اہم ترین اعضاء تک سب کے سب ایک ایسے نظم کے تحت چل رہے ہیں جو بعض دانشمندوں کے قول کے مطابق ہر ایک بالکل صحیح گھڑی کی مانند کام کر رہے ہیں جن کے سامنے کمپیوٹر بھی ہیچ ہیں۔

تو کیا اس قدر باعظمت جہان، انسان جس کے "کلّ" کا ایک معمولی سا "جز" ہے، وہ اسی طرح بے ہنگم، نامنظم اور جنگ و خونریزی اور ظلم و ستم میں ہمیشہ غرق رہے گا؟

آیا یہ تمام بے انصافیاں، یہ اخلاقی اور اجتماعی تباہ کاریاں جو بدنظمی کی اقسام میں سے ہیں ہمیشہ انسانی معاشرے پر حکم فرما رہیں گی؟

ان تمام معروضات کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ

کائنات کا نظام ہمیں اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ آخر کار انسانی معاشرہ کو نظم و عدالت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑے گا اور اپنی تخلیق کے اصل مقاصد کی طرف لوٹنا ہو گا۔

ب: دنیا بھر میں موجود تمام معاشرے ہمیشہ ترقی کی جانب گامزن ہیں جو عالم بشریت کے روشن مستقبل کی ایک اور دلیل ہے۔ کیونکہ اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ انسانی معاشرے نے جب سے اپنی ماہیت کو پہچانا ہے اس وقت سے ہمیشہ ترقی کی طرف گامزن ہے اور کسی بھی دور میں اس میں ٹھہراؤ نہیں آیا ہے۔

اگر مادی نکتۂ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ تھا جب مکان ، لباس، غذا اور آمد و رفت کے ذرائع بالکل ابتدائی مراحل میں تھے ، لیکن موجودہ دور میں ان چیزوں میں اس قدر ترقی آگئی ہے کہ عقل حیران اور آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔

یقیناً اس ترقی میں ابھی رکاوٹ نہیں آئی بلکہ روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

علمی اور سائنسی نکتہ نظر سے بھی اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس میدان میں بھی کافی ترقی ہوئی ہے اور روزانہ نت نئی ایجادات منصۂ شہود پر آرہی ہیں اور خدا جانے مستقبل میں اور کیسی کیسی ایجادات سامنے آتی ہیں ؟

جب مادی لحاظ سے معاشرے میں روز بروز ترقی ہو رہی ہے تو "تدریجی کمال" کا یہ قانون ہمیں بتا رہا ہے کہ روحانی ،معنوی اور اجتماعی میدان میں بھی ضرور ترقی ہو گی اور انسانیت کا قافلہ ایک منصفانہ قانون ،مستقل اور پائدار صلح اور عدالت اخلاقی اور روحانی فضائل کی طرف گامزن ہو گا۔

اگر آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ معاشرے میں اخلاقی گراوٹ میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے تو درحقیقت یہ چیز معاشرے میں مکمل انقلاب کے برپا کرنے کے لیے راہ ہموار کر رہی ہے۔

یعنی جب اخلاقی گراوٹ اپنے عروج کو جا پہنچے گی تو انسانیت اس سے اکتا جائے گی اور اپنے کمال کی جانب لوٹ جائے گی۔

ہم یہ ہرگز نہیں کہتے کہ غلط کاری اور فسق وفجور کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ فسق وفجور اور فتنہ وفساد جب حد سے بڑھ جائیں گے تو ان کے ردعمل کے طور پر ایک اخلاقی انقلاب ناگزیر ہو جائے گا۔

جب انسانیت ایک ایسے دوراہے پر پہنچ جائے گی کہ جہاں سے آگے بڑھنا اس کے لیے دشوار ہو جائے گا اور اپنے نامطلوب گناہوں کے انجام کو پہنچ جائے گی اور اس کی جان لبوں تک آجائے گی تو اس وقت ایک خدائی راہبر کے دیے ہوئے پروگرام کو قبول کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔

قرآن کریم اور امام مہدیؑ

عظیم آسمانی کتاب (قرآن مجید) میں متعدد آیات ایسی ملتی ہیں جو اس عظیم خدائی راہنما کے ظہور کی نوید دے رہی ہیں۔ اور ہم ان آیات میں سے صرف ایک آیت پر اکتفا کرتے ہیں:

سورۂ نور کی آیت ۵۵ میں ہے:

"وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ"

"خداوند عالم نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ وعدہ کیا ہے جو ایمان لے آئے اور عمل صالح انجام دیتے ہیں کہ انھیں زمین پر اسی طرح خلیفہ بنائے گا جس طرح تم سے پہلے لوگوں کو خلافت عطا کی تھی۔"

یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ انجام کار روئے زمین کی حکومت ظالم

اور جابر حکمرانوں کے ہاتھ سے نکل کر خدا کے صالح، نیک اور مومن بندوں کے ہاتھ آجائے گی۔ اور یہی لوگ روئے زمین پر حکومت کریں گے۔

اسی آیت میں آگے چل کر تین اور وعدوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ:

الف: لوگوں کے دلوں پر اللہ کی حکومت ہوگی اور دین کو مکمل غلبہ حاصل ہوگا۔

"وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ"

ب: ہر طرح کی بدامنی مکمل امن وسکون میں بدل جائے گی۔

"وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا"

ج: تمام روئے زمین سے شرک کا خاتمہ ہو جائے گا۔

"يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا"

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"هُمْ وَاللهِ شِيعَتُنَا يَفْعَلُ اللهُ ذٰلِكَ بِهِمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَّا وَهُوَ

مَہدِیُّ ہٰذِہِ الاُمَّۃِ "

"خدا کی قسم یہ ہمارے شیعوں کے بارے میں ہے اور خداوند عالم ہمارے خاندان کے ایک فرد کے ذریعہ اس حقیقت کو عملی جامہ پہنائے گا اور وہ شخص اس امت کا مہدی ہوگا۔" [۱]

۵۔ احادیثِ رسولؐ اور امام مہدیؑ

اس بارے میں کہ دنیا میں صلح و عدالت پر مبنی ایک حکومت قائم ہوگی جس کے فرمانروا اہلبیتِ پیغمبرؐ کے ایک فرد حضرت امام مہدی علیہ السلام ہوں گے اہل تسنن اور اہل تشیع کی کتب حدیث میں اس قدر زیادہ حدیثیں ملتی ہیں جو "تواتر" کی حد سے بھی بڑھ جاتی ہیں۔

اور یہ کہ وہ پیغمبرؐ کا بارہواں جانشین، دنیا کا بارہواں امام، امام حسینؑ کا نواں فرزند اور امام حسن عسکری علیہ السلام کا بلافصل بیٹا ہے شیعہ کتب میں تواتر کے ساتھ مذکور ہے۔

ظہور امام مہدی علیہ السلام کے بارے میں اہلسنت کے نظریہ کے مطابق احادیث کے متواتر ہونے میں یہی کہنا کافی ہے کہ اہلسنت کے علماء اور دانشمندوں نے انھیں صراحت کے ساتھ اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔ حتیٰ کہ حجاز کے بہت بڑے مرکز "رابطۃ العالم الاسلامی" کی طرف سے ابھی کچھ عرصہ پہلے ایک رسالہ شائع ہوا ہے جس میں یوں لکھا ہے:

---

[۱] تفسیر مجمع البیان۔ سورہ نور آیت ۵۵

" وہ (امام مہدیؑ) پیغمبرؐ کے بارہ خلفائے راشدین سے آخری خلیفہ ہے جس کے بارے میں آنحضرتؐ کی جانب سے صحیح حدیثوں میں خبر دی گئی ہے اور مہدیؑ کے بارے میں پیغمبر اسلامؐ کے بہت سے صحابہ سے روایات منقول ہیں ۔"

پھر ان بیس صحابہ کے نام بتانے کے بعد کہ جنھوں نے آنحضرتؐ سے امام مہدیؑ کے بارے میں حدیثیں بیان کی ہیں یوں لکھا ہے کہ :

" ان (بیس اصحاب) کے علاوہ اور بھی بہت سے حضرات ہیں جنھوں نے مہدی (علیہ السلام) کے بارے میں احادیث کو نقل کیا ہے .... بلکہ بعض اہل سنت دانشوروں نے تو اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی ہیں جن میں سے ابونعیم اصفہانی ، ابن حجر ہیثمی ، شوکانی ، ادریس مغربی اور ابوالعباس ابن عبد المومن کے نام زیادہ قابل ذکر ہیں ۔"

آگے چل کر لکھا ہے کہ :

" اہلسنت کے بہت سے گزشتہ بزرگوں اور موجودہ علماء نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ ظہور مہدیؑ کی احادیث متواتر ہیں ۔"

ان علماء اور بزرگوں کا نام ذکر کرنے کے بعد آخر میں تحریر کیا ہے کہ :

" حفاظ اور محدثین کا ایک گروہ صراحت کے ساتھ

کہنا ہے کہ مہدیؑ کے بارے میں بیان ہونے والی
احادیث کچھ تو "صحیح" ہیں اور کچھ "حسن" اور مجموعی
طور پر قطعاً "متواتر" ہیں۔ لہٰذا امام مہدیؑ
کے ظہور پر ایمان رکھنا واجب ہے اور یہ اہلسنت
کے مسلّم عقائد میں سے ہے جس کا انکار جاہل
اور بدعتی لوگوں کے علاوہ اور کوئی نہیں کرتا۔"

۲۔ شیعہ احادیث

شیعہ مکتب فکر میں حضرت امام مہدی آخرالزمان عجل اللہ فرجہ الشریف کے ظہور کے بارے میں اس قدر زیادہ احادیث پیغمبر اسلامؐ اور ائمہ ھدیٰ علیہم السلام سے مروی ہیں جو حد تواتر سے بھی بڑھ جاتی ہیں۔

اور شیعوں کے نزدیک "ظہور مہدیؑ" کا عقیدہ ضروریاتِ مذہب میں سے ہے۔ جس کے انکار سے انسان دائرۂ شیعیت سے خارج ہو جاتا ہے

اور یہ عقیدہ اس قدر واضح اور روشن ہے کہ اگر کسی بھی ملک کے رہنے والے شیعوں کے کسی بھی سن و سال کے فرد سے امام مہدیؑ کے بارے میں سوال کیا جائے تو وہ فوراً امامؑ کی خصوصیات، ظہور کی علامات، طرز حکومت اور مختلف پروگراموں کے متعلق بتا دے گا۔

علماء شیعہ نے اولین صدیوں سے اب تک اس مسئلہ سے متعلق متعدد کتب تحریر فرمائی ہیں اور اس سلسلہ میں احادیث جمع کی ہیں۔

نمونے کے طور پر ہم یہاں دو تین حدیثیں بیان کریں گے۔ مزید تفصیلات کے لیے مندرجہ ذیل کتابوں کے مطالعہ کی دعوت دیں گے۔

"مہدی انقلابی بزرگ (یہ کتاب اردو میں 'بہار انقلاب' کے نام سے دستیاب ہے)، "نوید امن و امان" اور عالم بزرگوار سید صدر الدین صدر کی کتاب "المہدی"

پیغمبر اسلامؐ کا ارشاد ہے:

"لَوْلَمْ يَبْقَ مِنَ الدَّهْرِ
اِلَّا يَوْمٌ لَطَوَّلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ الْيَوْمَ
حَتّٰى يَبْعَثَ رَجُلًا مِنْ اَهْلِ بَيْتِيْ
يَمْلَأُهَا قِسْطًا وَعَدْلًا كَمَا
مُلِئَتْ ظُلْمًا وَجَوْرًا"

"اگر زندگانیٔ دنیا سے صرف ایک دن باقی رہ جائے تو خداوند عالم اس دن کو اس قدر طولانی کر دے گا کہ میرے اہلبیتؑ میں سے ایک شخص ظہور کرے گا اور وہ زمین کو اس قدر عدل و انصاف سے پُر کر دے گا جس طرح اس سے پہلے وہ ظلم و جور سے پُر ہو چکی ہو گی"۔ [۱]

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِذَا قَامَ الْقَائِمُ حَكَمَ بِالْعَدْلِ

---

[۱] یہ حدیث شیعہ اور سنی کی اغلب کتابوں میں مذکور ہے۔

وَارْتَفِعَ الْجَوْرُ فِی اَیَّامِہٖ وَ
اٰمِنَتْ بِہِ السُّبُلُ وَاَخْرَجَتِ
الْاَرْضُ بَرَکَاتِھَا وَرُدَّ کُلُّ حَقٍّ
اِلٰی اَھْلِہٖ ...... وَحَکَمَ بَیْنَ
النَّاسِ بِحُکْمِ دَاوٗدَ وَحُکْمِ
مُحَمَّدٍ (ص) فَحِیْنَئِذٍ تُخْرِجُ
الْاَرْضُ کُنُوْزَھَا وَتُبْدِیْ بَرَکَاتِھَا
وَلَا یَجِدُ الرَّجُلُ مِنْکُمْ یَوْمَئِذٍ
مَوْضِعاً لِصَدَقَتِہٖ وَلِبِرِّہٖ لِشُمُوْلِ
الْغِنٰی جَمِیْعَ الْمُؤْمِنِیْنَ ......"

"جب قائم قیام کرے گا اور حکومت کو عدل و انصاف کے اصولوں پر چلائے گا تو اس کے زمانے میں ظلم و جور کا خاتمہ ہو جائے گا، راستے پر امن ہو جائیں گے، زمین اپنی برکتیں ظاہر کر دے گی، ہر ایک کو اپنا صحیح حق مل جائے گا۔ وہ (قائم) لوگوں کے درمیان حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح فیصلہ کرے گا
.....اسی دوران زمین اپنے تمام دفینے اگل دے
گی اور اپنی ساری برکتیں اس کے سامنے ظاہر
کردے گی اور اس وقت کوئی شخص ایسا نہیں
ملے گا جو صدقے اور خیرات کا مستحق ہو کیونکہ تمام
مومنین اس چیز سے مستغنی اور بے نیاز ہو جائیں
گے......) [1]

سوالات

(۱) —— دنیا کے مستقبل کے بارے میں مادہ پرستوں اور خدا پرستوں کا کیا نظریہ ہے؟ اور ان کا آپس میں کیا فرق ہے؟

(۲) —— آیا فطری طور پر امام مہدیؑ کے ظہور کے بارے میں آپ کے پاس کوئی دلیل ہے؟

(۳) —— آیا امام کے ظہور پر آپ کے پاس کوئی عقلی دلیل ہے؟ کونسی؟

(۴) —— قرآن مجید ظہور مہدیؑ کے بارے میں کیا کہتا ہے؟

(۵) —— احادیث رسولؐ وائمہ اس بارے میں موجود ہیں؟ کونسی؟

---

[1] بحار الانوار۔ جلد ۱۳۔ مطبوعہ قدیم

امامتِ عامہ
یا
ولایتِ فقیہ

فہرست اسباق

پہلا سبق

ولایت فقیہ ــــــــ ۱۰۹

دوسرا سبق

"فقہ" اور "فقیہ" کا مفہوم ــــــــ ۱۱۸

تیسرا سبق

حاکم اور راہبر کی خصوصیات ــــــــ ۱۳۱

چوتھا سبق

انسانوں کو حکومت کی ضرورت ہے ــــــــ ۱۳۷

پانچواں سبق

حکمراں کی خصوصیات علی بن ابیطالبؑ کی نظر میں ــــــــ ۱۴۶

چھٹا سبق

اسلامی حکمران کے فرائض ــــــــ ۱۵۲

پہلا سبق

ولایتِ فقیہ

ولایتِ فقیہ کا معنیٰ

سب سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "ولایت" اور "فقیہ" کے مفہوم اور معنیٰ کو بیان کیا جائے

۱:- ولایت کے معنیٰ :

ولایت " دو فریقوں کے درمیان ایک ایسی نسبت ہے جس میں ایک فریق دوسرے پر اختیار رکھتا ہے"۔ درحقیقت ولایت میں تین چیزیں ضروری ہوتی ہیں :

1. ـــــ ایک ولی ،
2. ـــــ دوسرے مولیٰ علیہ (جس پر ولی کو اختیار حاصل ہوتا ہے)

(۳) —— تیسری چیز "امر" (جو ولی، اپنے مولیٰ علیہ کے بارے میں انجام دیتا ہے۔)

ولایت کا معیار "امر" پر موقوف ہوتا ہے۔ امر جس قدر اہم ہوگا ولایت کا دائرہ بھی اسی قدر وسیع اور اہم ہوگا۔ گویا "امر" کی وسعت "ولایت" کے وسیع ہونے کی علامت ہے۔

پس "ولایت فقیہ" یعنی معصوم کی غیبت کے زمانے میں معاشرے کے تمام اختیارات اور تمام امور کی سرپرستی "ولی فقیہ" کے پاس ہے۔

—— . —— . ——

ولایت کی قسمیں

ولایت کی دو قسمیں ہیں:

(۱) —— ولایت تکوینی —— اور

(۲) —— ولایت تشریعی۔ [1]

کام کے انجام دینے کی قدرت کو "ولایت تکوینی" اور کام کی انجام دہی کے حکم دینے کو "ولایت تشریعی" کہتے ہیں۔

نیز ولایت کی دو قسمیں اور بھی ہیں:

ایک اصلی اور دوسری فرعی۔

ولایت اصلی وہی خدا کی ولایت اور ولایت فرعی ان لوگوں کی ولایت ہے

---

[1] مزید تفصیلات کے لیے آیت اللہ صافی کی کتاب "ولایتِ تکوینی و تشریعی" کا مطالعہ کیا جائے۔

جنھیں خداوندِ عالم کی طرف سے یہ منصب عطا ہوتا ہے۔
جیسے انبیاءؑ، ائمہ معصومینؑ اور ولی فقیہ کی ولایت۔
اور ولایتِ فرعی درحقیقت تابع ہوتی ہے ولایتِ اصلی کے۔ یعنی خداوندِ عالم کے اذن اور اجازت کے بغیر ولایتِ فرعی ایک بے معنی سی چیز ہوتی ہے۔
اور پھر ولایت کی دو قسمیں ہیں: ولایت عام اور ولایت خاص۔
ولایت عام یا ولایت مطلقہ صرف اور صرف خدا کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے جسے ولایت حقیقی بھی کہتے ہیں اور غیر اللہ سے اس ولایت کی نفی کی گئی ہے۔
چنانچہ خداوند متعال فرماتا ہے:

- "اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ"

" کیا تم نہیں جانتے کہ آسمان اور زمین کی سلطنت بلاشبہ خاص خدا ہی کے لیے ہے اور خدا کے سوا تمھارا نہ کوئی ولی ہے نہ مددگار۔

(سورہ بقرہ - آیت ۱۰۷)

- "اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَاءَ ۚ فَاللّٰہُ ھُوَ الْوَلِیُّ وَھُوَ یُحْیِ الْمَوْتٰی ۫

وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ"

" کیا ان لوگوں نے خدا کے سوا (دوسرے) کارساز بنائے ہیں تو کارساز بس خدا ہی ہے اور وہی مُردوں کو زندہ کرے گا اور وہی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

(سورہ شوریٰ - آیت ۹)

● ــــ "وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ"

" اور اگر خدا چاہتا تو ان سب کو ایک ہی گروہ بنا دیتا مگر وہ تو جس کو چاہتا ہے (ہدایت کرکے) اپنی رحمت میں داخل کرلیتا ہے اور ظالموں کا تو (اس دن) نہ کوئی یار ہے نہ مددگار۔"

(سورہ شوریٰ ۴۲ - آیت ۸)

ولایتِ خاصہ کی پھر دو قسمیں ہیں:
ایک مثبت اور دوسرے منفی۔
اور ولایتِ مثبت چار قسم کی ہوتی ہے:

● ــــ ولاءِ محبت یا قرابت:

"قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا

اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی "

" (اے رسولؐ) تم کہہ دو کہ میں اس (تبلیغ رسالت) کا اپنے قرابت داروں (اہل بیت) کی محبت کے سوا تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا۔"

(سورۂ شوریٰ ۴۲ - آیت ۲۳)

- ولاءِ امامت یا دین کی پیشوائی :

" مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ"

" ہاں جو تم کو رسولؐ دے دیں وہ لے لیا کرو اور جس سے منع کیا کریں اس سے باز رہو۔"

(سورۂ حشر ۵۹ - آیت ۷)

- ولاءِ زعامت یا سیاسی قیادت :

" اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ "

" خدا کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اور جو تم میں سے صاحبانِ امر ہوں ان کی اطاعت کرو۔"

(سورۂ نساء ۴ - آیت ۵۹)

- ولاءِ اخوت یا ایمانی برادری :

"اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ"

"مومنین تو آپس میں بس بھائی بھائی ہیں۔"

(سورہ الحجرات ۴۹ - آیت ۱۰)

"مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ"

"محمدؐ خدا کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، کافروں پر بڑے سخت اور آپس میں بڑے رحم دل ہیں۔"

(سورہ فتح ۴۸ - آیت ۲۹)

اسی طرح آیہ قرآنی:

"وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ۔"

"اور ایماندار مرد اور ایماندار عورتیں ان میں سے بعض کے بعض رفیق ہیں لوگوں کو اچھے کام کا حکم دیتے ہیں اور برے کام سے روکتے ہیں۔"

(سورہ توبہ ۹ - آیت ۷۱)

ولایت منفی:

● ـــ دشمنانِ خدا کی ولایت:

"یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ"

"اے ایماندارو اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے اور میری خوشنودی کی تمنا میں (گھر سے) نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔"

(سورۂ ممتحنہ ۶۰۔ آیت ۱)

● طاغوت کی ولایت :

"وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَوْلِیٰٓئُھُمُ الطَّاغُوْتُ"

"اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے سرپرست طاغوت ہیں۔"

(سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۵۷)

● یہود اور نصاریٰ کی ولایت :

"یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ"

"اے ایماندارو! یہودیوں اور نصرانیوں کو اپنا سرپرست نہ بناؤ۔"

(سورہ مائدہ ۵۔ آیت ۵۱)

● شیطان کی ولایت :

"وَمَنْ یَتَّخِذِ الشَّیْطٰنَ وَلِیًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِیْنًا"

"اور (یہ یاد رہے کہ) جس نے خدا کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا سرپرست بنایا تو اس نے کھلم کھلا سخت گھاٹا اٹھایا۔"

(سورۂ نساء ۴۔ آیت ۱۱۹)

● کفار کی ولایت:

"لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ"

"مومنین مومنین کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا سرپرست نہ بنائیں۔"

(سورۂ آل عمران ۳۔ آیت ۲۸)

"لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَکُمْ وَاِخْوَانَکُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْکُفْرَ عَلَی الْاِیْمَانِ۔" [۱]

"اگر تمھارے (ماں) باپ اور تمھارے (بہن) بھائی ایمان

کے مقابلہ میں کفر کو ترجیح دیتے ہوں تو تم ان کو (اپنا) خیرخواہ نہ سمجھو۔"

(سورۂ توبہ ۹ - آیت ۲۳)

مزید تفصیلات کے لیے کتاب " ولاءھا و ولایتھا "کا مطالعہ کیجیے جو اردو زبان میں" فلسفۂ ولایت" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

دوسرا سبق

"فقہ" اور "فقیہ" کا مفہوم

فقہ :

- ——— ظاہری معلومات کے ذریعے باطنی (عقلی) معلومات تک رسائی۔
- ——— شرع مقدس اسلام کے احکام کی معلومات۔
- ——— مطلقاً "سمجھنا"۔ یہ ہیں فقہ کے معانی

فقیہ :

" فقیہ وہ شخص ہوتا ہے جو اسلامی احکام کے سلسلے میں درجہ اجتہاد پر فائز اور فقہی احکام کو حاصل کرنے میں ماہر ہو۔"

کیونکہ "تفقہ" کے معنی، شرع مقدس اسلام کے احکام کی مکمل آگاہی ہوتا ہے لہٰذا فقیہ کو ان احکام کی مہارت حاصل ہونی ضروری ہے۔[1]

ہر شخص کو فقیہ نہیں کہتے بلکہ یہ ایک خاص اصطلاح ہے اور صرف اس شخص کو فقیہ کہا جاتا ہے جو فروع دین کے مسائل میں (دوسری شرائط کے ہوتے ہوئے) درجہ اجتہاد پر فائز ہو۔

"ولایتِ فقیہ" کیوں ضروری ہے؟

اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمارے پاس مندرجہ ذیل اہم دلیل ہے جس کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرائی جاتی ہے۔

دعوت کا عام ہونا

ہر ایک کو معلوم ہے کہ اسلام تمام انسانوں کا دین ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں ہے:

"وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ"[2]

"اے پیغمبرؐ ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام انسانوں کے لیے"

" قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب "مفرداتِ راغب"

[2] سورہ سبا ۳۴ - آیت ۲۸

اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ جَمِیۡعًا " [1]

" اے پیغمبرؐ ان سے کہہ دیجیے کہ اے لوگو! میں تم سب لوگوں کی طرف اللہ کا رسولؐ ہوں ۔"

پس معلوم ہوا کہ اسلام تمام انسانوں کا دین اور اس کی دعوت عام ہے ۔

ختمِ نبوّت

اس سلسلے میں خدا فرماتا ہے :

" وَمَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِکُمۡ وَلٰکِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ۔" [2]

" محمدؐ تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ وہ تو اللہ کے رسول اور خاتم الانبیاء ہیں "

اس لحاظ سے اب کوئی اور پیغمبر نہیں آئے گا ۔

دین تا قیامت ہے

دین اسلام قیامت تک زندہ اور پائندہ ہے دوسرا اور کوئی دین

---

[1] سورۂ اعراف آیت ۱۵۸

[2] سورۂ احزاب ۳۳ آیت ۴۰

ہرگز نہیں آئے گا۔

خدا فرماتا ہے:

"اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ" ۱؎

اور حدیث شریف میں ہے:

"حَلَالُ مُحَمَّدٍ حَلَالٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَحَرَامُهُ حَرَامٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ" ۲؎

تو اس لحاظ سے دین اسلام کا قیامت تک باقی رہنا ثابت ہے کیونکہ افراد بشر کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے جو کچھ لازم ہے ان کے پہنچانے اور حقائق الہٰی کے بیان کرنے میں اسلام نے کوئی پہلو ناقص نہیں چھوڑا۔

خدا فرماتا ہے:

"وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ" ۳؎

۱؎ سورۂ حجر[۱۵] آیت ۹

۲؎ کافی جلد ۱ صفحہ ۵۷

۳؎ سورہ انعام[۶] آیت ۵۹

"کوئی خشک و تر چیز ایسی نہیں ہے جس کا ذکر قرآن میں نہ ہو۔"

تو گویا قانونی نکتۂ نظر سے انسانی معاشرے کے کمال اور ترقی کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اسلام میں ان میں سے کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہے۔

نتیجہ

ان تمام معروضات کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ امام معصومؑ کی غیبت کے زمانے میں امت مسلمہ کی رہنمائی اور اسلامی دعوت کو آگے بڑھانے کے سلسلے میں اسلام نہ تو لاتعلق رہ سکتا ہے اور نہ ہی اسے لوگوں کی مرضی پر چھوڑ سکتا ہے۔

ولایتِ فقیہ یا انبیاء اور ائمہ کا مشن ان کے دورِ غیبت میں:

ایک آیڈیل یا پسندیدہ معاشرے کے وجود میں لانے کے لیے اسلام نے بہترین اور حیات بخش امور کی تعلیم دی ہے اور ان کی طرف راہنمائی فرمائی ہے۔ مثلاً راہبر کی خصوصیات اور اس کی اطاعت کے بارے میں فرماتا ہے:

"اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ"

اطاعت صرف خدا کی ذات کے لیے سزاوار ہے اور اس اطاعت کا اظہار خدا کے برگزیدہ لوگوں (پیمبرؐ اور صاحبانِ امر) کی اطاعت سے ہوتا ہے۔ یہی

وجہ ہے کہ اس سلسلے میں خدا کی اطاعت کے بعد رسولؐ کی اور رسولؐ کے بعد اولی الامر کی اطاعت کا تذکرہ ہے اور اس "حکومت" کی حقیقت بالترتیب نبوت، امامت اور ولایت فقیہ کی اطاعت میں مضمر ہے۔

اسلامی معاشرے میں امامت کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا اور نہ کبھی منقطع ہوگا کیونکہ اس حقیقت کا اعلان آنحضرتؐ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں وصیت کے طور پر ان لفظوں میں فرما دیا تھا:

"اِنِّیْ تَارِكٌ فِیْكُمُ الثَّقَلَیْنِ
مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ
تَضِلُّوْا كِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِیْ
اَهْلَ بَیْتِیْ وَاِنَّهُمَا لَنْ یَّفْتَرِقَا
حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ۔"[1]

اسلامی معاشرے میں کتاب اور عترت لازم و ملزوم ہیں، قرآن مجید حقیقی اور صحیح مفسر کے بغیر کبھی ہادی نہیں بن سکتا اور امامت کتابِ خدا کے بغیر "امامت" نہیں کہلا سکتی۔

امامؑ کبھی تو باقاعدہ اور مستقل طور پر امور کو انجام دیتا ہے اور کبھی پیغمبرؐ کے نائب کی صورت میں انسانی معاشرے کی گتھیوں کو سلجھاتا ہے۔ اس نکتے

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۸ صفحہ ۱۹ حدیث نمبر ۹۔ اور صاحب عبقات الانوار نے ۵۲۰ کتابوں سے اس حدیث کو رسولِ خداؐ سے نقل کیا ہے۔

کے اچھی طرح واضح ہوجانے کے بعد ولایت فقیہ کا مفہوم روشن ہوجاتا ہے کہ" فقیہ" ہمیشہ" امامؑ" کے مقاصد کی تکمیل کے لیے قدم اٹھاتا ہے اور امامت ، نبوت کے مقاصد کی تکمیل کرتی ہے۔

"فقیہ" کون ہوتا ہے؟

امامت کی نیابت کا بوجھ اٹھانے کا ہر شخص اہل نہیں ہوتا۔ اس سنگین بوجھ کو صرف وہ فقیہ ہی اٹھا سکتا ہے جس میں مندرجہ ذیل شرائط پائی جائیں :

الف :- زبانِ وحی سے مکمل آشنا ہو۔

ب :- خدا اور اس کی مخلوق کے نزدیک اس کا تقویٰ مسلم ہو۔

ج :- "اجتہاد" کا ملکہ رکھتا ہو اور ادلۂ اربعہ (قرآن، سنت ، اجماع اور عقل) کی روشنی میں احکام اسلامی اور مسائل شرعی کو آیاتِ قرآن اور احادیثِ معصومینؑ سے استنباط کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔

چنانچہ مندرجہ بالا شرائط اور بعد میں ذکر ہونے والی دوسری شرائط جس شخص میں پائی جائیں وہ "فقیہ" کہلاتا ہے اور ولایتِ فقیہ نیز معاشرے کی قیادت کا سنگین بوجھ اٹھانا اس کے ذمہ ہوتا ہے۔

ولایت فقیہ، معصومینؑ کی زبانی

اس وقت ہم غیبتِ امام علیہ السلام کے زمانے میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور اسلامی معاشرے کی قیادت اور" ما انزل اللہ "کی تبلیغ کا بوجھ" ولایتِ فقیہ "کے ذمے ہے لہٰذا اس بارے میں ہم چند احادیث کا تذکرہ ضروری

سمجھتے ہیں:

● — عَنْ اَبِی عَبْدِاللّٰہِ (۴) قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ (ص) یَحْمِلُ هٰذَا الدِّیْنَ فِیْ کُلِّ قَرْنٍ عَدُوْلٌ یَنْفُوْنَ عَنْهُ تَاوِیْلَ الْمُبْطِلِیْنَ وَ تَحْرِیْفَ الْغَالِیْنَ وَانْتِحَالَ الْجَاهِلِیْنَ۔" [1]

امام جعفر صادق علیہ السّلام فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: ہر دور اور زمانے میں کچھ عادل لوگ (فقہائے جامع الشرائط اور عادل) موجود ہوں گے، جو غلط تفسیر اور تاویل کرنے والوں تحریف کرنے والے غالیوں اور دین کو مٹانے والے جاہلوں کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے اور انھیں نیست و نابود کر دیں گے۔

● — "قَالَ الْاِمَامُ الْحُسَیْنُ عَلَیْهِ السَّلَام: مَجَارِی الْاُمُوْرِ وَالْاَحْکَامِ عَلٰی اَیْدِی الْعُلَمَاءِ بِاللّٰہِ الْاُمَنَاءِ عَلٰی حَلَالِهٖ وَحَرَامِهٖ" (تحف العقول)

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۸ صفحہ ۱۰۹ - حدیث ۴۳

"امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں: مسلمانوں کے امور کو چلانے اور احکام اسلام کو نافذ کرنے کا حق علماء ربانی کو حاصل ہے جو خدا کے حلال اور حرام کے امین ہیں۔"

● —— "قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (ص) اَلْفُقَهَاءُ اُمَنَاءُ الرُّسُلِ"

"فقہاء پیغمبروں کے امین ہیں" [1]

● —— قَالَ الصَّادِقُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: مَنْ كَانَ مِنْكُمْ قَدْ رَوٰى حَدِيْثَنَا وَنَظَرَ فِيْ حَلَالِنَا وَحَرَامِنَا وَعَرَفَ اَحْكَامَنَا فَلْيَرْضَوْا بِهٖ حَكَمًا فَاِنِّيْ قَدْ جَعَلْتُهٗ عَلَيْكُمْ حَاكِمًا فَاِنْ حَكَمَ بِحُكْمِنَا فَلَمْ يَقْبَلْ مِنْهُ فَاِنَّمَا اسْتَخَفَّ بِحُكْمِ اللّٰهِ وَعَلَيْنَا رَدَّ وَالرَّادُّ عَلَيْنَا كَالرَّادِّ عَلَى اللّٰهِ وَهُوَ عَلٰى حَدِّ الشِّرْكِ بِاللّٰهِ۔" [2]

---

[1] کتاب "ولایت فقیہ" امام خمینی۔ صفحہ ۸۰۔

[2] کتاب "کشف الاسرار۔ امام خمینی صفحہ ۱۸۸

" امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جو شخص ہماری احادیث اور روایات کو بیان کرتے ہیں اور ہمارے بیانات کی روشنی میں حلال اور حرام کو بیان کرتے ہیں، ہمارے احکام کے بارے میں مکمل معلومات رکھتے ہیں تمھارا فرض بنتا ہے کہ ان کی اتباع کرو۔ اور ان کے فیصلوں کو قبول کرو کیونکہ میں نے ایسے لوگوں کو تمھارے اوپر حاکم بنا دیا ہے لہٰذا جو شخص ان کے فیصلوں کو ٹھکرائے گا گویا وہ خدا کے حکم کو ٹھکرائے گا اور حکم خدا کا ٹھکرانا شرک کی حد تک پہنچا دیتا ہے۔"

● ——— قَالَ رَسُولُ اللهِ (ص) اَلْفُقَهَاءُ اُمَنَاءُ الرُّسُلِ مَالَمْ يَدْخُلُوا فِي الدُّنْيَا. قِيلَ يَارَسُولَ اللهِ: وَمَا دُخُولُهُمْ فِي الدُّنْيَا. قَالَ: اِتِّبَاعُ السُّلْطَانِ فَاِذَا فَعَلُوا ذٰلِكَ فَاحْذَرُوهُمْ عَلٰى دِيْنِكُمْ". [۱]

پیغمبر خدا ؐ نے فرمایا: فقہاء انبیاء کے امین ہوتے ہیں،

---

[۱] کافی ج ۱ صفحہ ۴۶

جب تک دنیاوی لالچ میں نہ آئیں۔ پوچھا گیا یا حضرت ؑ دنیاوی لالچ سے کیا مراد ہے؟۔آپ ؑ نے فرمایا: درباری اور طاغوتی علماء نہ بنیں۔اگر وہ ایسا کریں تو تمھیں ایسے لوگوں سے اپنا دین بچانا چاہیئے۔

● —— بارہویں امام حضرت صاحب الزمان علیہ السلام نے اسحاق بن یعقوب کے سوال کے جواب میں فرمایا:

"وَاَمَّا الْحَوَادِثُ الْوَاقِعَةُ فَارْجِعُوْا اِلٰی رُوَاةِ حَدِیْثِنَا فَاِنَّهُمْ حُجَّتِیْ عَلَیْکُمْ وَاَنَا حُجَّةُ اللّٰهِ عَلَیْهِمْ"[1]

"اجتماعی مشکلات اور پیدا ہونے والے نت نئے مسائل کے بارے میں ہمارے راویان حدیث کی طرف رجوع کرو۔ کیونکہ وہ میری طرف سے تم پر حجت ہیں اور میں خدا کی طرف سے ان پر حجت ہوں۔"

● —— قَالَ الْاِمَامُ الْعَسْکَرِیُّ (ع) فَاَمَّا مَنْ کَانَ مِنَ الْفُقَهَاءِ صَائِنًا لِنَفْسِهٖ حَافِظًا لِدِیْنِهٖ مُخَالِفًا عَلٰی

---

[1] کتاب "اکمال الدین صفحہ ۴۸۳ اور کتاب وسائل الشیعہ ج ۱۸۔ صفحہ ۱۰۱

هَوَاهُ مُطِيعاً لِأَمْرِ مَوْلَاهُ فَلِلْعَوَامِ
أَنْ يُقَلِّدُوهُ وَذٰلِكَ لَا يَكُوْنُ إِلَّا بَعْضَ
فُقَهَاءِ الشِّيْعَةِ لَا كُلَّهُمْ۔"

"فقہار میں سے جو شخص اپنے اوپر قابو رکھتا ہو، اپنے دین کا محافظ ہو، اپنی خواہشاتِ نفسانی کا مخالف ہو اور اپنے مولا کے فرمان کا تابع ہو تو عوام کا فرض بنتا ہے کہ وہ ایسے شخص کی تقلید کریں اور یہ صفات بعض شیعہ فقیہوں میں پائی جاتی ہیں نہ کہ سب میں۔" [1]

● بحار الانوار جلد دوم (جدید ایڈیشن) صفحہ ۱۴۵ میں مختلف ذرائع سے کئی احادیث آنحضرت سے بیان کی گئی ہیں جن میں ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

"اَللّٰهُمَّ ارْحَمْ خُلَفَائِيْ (ثلاثاً)
قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَنْ خُلَفَائُكَ؟
قَالَ: اَلَّذِيْنَ يَأْتُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ
وَيَرْوُوْنَ حَدِيْثِيْ وَسُنَّتِيْ"

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۸ صفحہ ۹۴

رسول خداؐ نے تین بار فرمایا :
خدایا میرے خلفاء پر رحم فرما۔ لوگوں نے پوچھا۔یا رسول اللہؐ! آپ کے خلفاء و جانشین کون لوگ ہیں ؟
آپؐ نے فرمایا۔ وہ جو میرے بعد میری احادیث و سنت کو لوگوں تک پہنچائیں گے۔

تیسرا سبق

حاکم اور راہبر کی خصوصیات

حکومت اسلامی کے اہم امتیازات میں سے ایک امتیاز اور اہم خصوصیات میں سے ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ معاشرے کی سیاسی قیادت اور اس کی راہبری کے لیے چند شرائط کو ضروری جانتی ہے۔

اسلامی نکتۂ نظر سے حاکم یا "راہبر" ملت کا امین، آزادی کا حامی مظلوموں اور مستضعفین کا ناصر، مستکبرین کا زبردست دشمن، استقلال کا محافظ اور عوام کا خدمت گار ہوتا ہے۔

اسلامی جمہوریہ ایران کے بانی اور قائد کا معروف جملہ "اگر مجھے خدمت گزار کہیں بہتر ہے اس سے کہ مجھے رہبر کہیں" اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

اسلام کا سیاسی فلسفہ ہی یہ ہے کہ مظلوم عوام کو مستکبرین کے چنگل سے آزادی دلائی جائے۔ شرک، نفاق اور طاغوتی نظاموں کی بیخ کنی کی جائے۔

ایران اور روم کی سات سو سالہ تاریخی جنگ ہو یا پہلی اور دوسری جنگِ عظیم بلکہ ہر وہ جنگ جو سپر طاقتوں، سامراجیوں اور استعماریوں کے ذریعے معرضِ وجود میں آچکی ہے اس میں سے کسی کا فلسفہ عوام کی آزادی اور ان کے لیے حق و انصاف کا حصول نہیں تھا کیونکہ ان سب کی شیطانی سیاست کا محور ایک تھا۔

ایک مرتبہ امیر المومنین علی علیہ السلام کا لشکر شہر کے باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا اور ابنِ عباس اسی دوران آقا امیر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دیکھا کہ آپؑ اپنے جوتے کو خود ہی ٹانکے لگا رہے ہیں۔

ابنِ عباس کو یہ منظر عجیب دکھائی دیا (کہ اسلامی مملکت کا سربراہ اپنے جوتے آپ ہی ٹانک رہا ہے) لیکن مولائے کائنات نے ان کی طرف منہ کر کے فرمایا:

"اس جوتے کی کیا قیمت ہو گی ؟"

ابنِ عباس نے کہا:

"قیمت کیا ہونی ہے ؟ یہ تو بالکل ہی ختم ہو چکا ہے۔"

علی علیہ السلام نے فرمایا:

"حقیقت یہ ہے کہ یہ جوتا میرے نزدیک تم پر حکومت کرنے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے مگر یہ کہ حق کو قائم کرنے اور باطل کو سرکوب کرنے کی توفیق حاصل کروں۔" [1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

اسے کہتے ہیں خدا کی رضا اور مخلوق کی خدمت کے لیے حکومت۔

..... علی علیہ السلام کا ۲۵ سال تک خاموشی کے ساتھ بیٹھ رہنا ـــــ امام حسن مجتبیٰ کا صلح کر لینا ـــــ سید الشہداء علیہ السلام کا میدان کربلا میں شہید ہو جانا ـــــ اور اولاد حسینؑ کے ایک نامور فرد (امام خمینی) کی قیادت میں ملّتِ ایران کا طاغوت کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

یعنی خدا کی رضا اور مخلوق کی خدمت کے لیے حکومت۔

حاکمیت اور حاکم کی شناخت کا مسئلہ نہایت ہی اہم ترین مسائل میں سے ہے۔ اسلام میں حاکمیت کا حق صرف خدا، رسولؐ، ائمہ معصومینؑ اور ان کے خصوصی نائبین کو ہی حاصل ہے۔

کیونکہ خدا فرماتا ہے:

" اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ "

(سورۂ نساء - آیت ۵۹)

اسلامی نکتۂ نظر سے انسانی معاشرے پر معصوم کی حاکمیت ہمیشہ برقرار ہے۔ اور معصومؑ کی غیبت کے زمانے میں اس کی نیابت کے طور پر

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) ..... فَقَالَ لِی " مَا قِیْمَةُ هٰذَا النَّعْلِ؟ فَقُلْتُ لَا قِیْمَةَ لَهَا۔ فَقَالَ: وَاللّٰهِ لَهِیَ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اِمْرَتِكُمْ اِلَّا اَنْ اُقِیْمَ حَقًّا اَوْ اَدْفَعَ بَاطِلًا " (نہج البلاغۃ خطبۃ ۳۳)

حاکمیت کا حق " ولی فقیہ " کو حاصل ہے۔

ولایتِ فقیہ یا امامِ معصومؑ کی غیبت کے زمانے میں معاشرے کی سرپرستی ایسے شخص کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو اسلامی مسائل سے پوری طرح آگاہ، فقہ اسلامی کا ماہر، حالاتِ حاضرہ سے مکمل آشنا، متقی، خداترس، حریت کا پیکر، ملت کا خیرخواہ اور دینی امور کا دل سے معتقد ہو، دوسرے لفظوں میں " دین شناس اور دیندار " ہو۔

سوال کیا جاتا ہے کہ :

آیا " ولایتِ فقیہ " اسلامی انقلاب کی پیداوار نہیں ہے؟

اس کے جواب میں عرض ہے کہ :

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ولایت فقیہ کو ایران کے اسلامی انقلاب کی پیداوار سمجھتے ہیں لیکن اگر اس بارے میں ذرا سا بھی غور و فکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ :

● —— یہ ولایتِ فقیہ ہی تھی جس نے آٹھ گھنٹوں سے بھی کم مدت میں پورے ایران کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اور اپنی خدائی طاقت (یعنی مرحوم آیۃ اللہ میرزائے شیرازی کے تمباکو کی حرمت کے فتوے) کے ذریعے انگریزی سامراج کے خون آشام ہاتھوں کو ایران کے مظلوم و محروم عوام کی طرف بڑھنے سے کاٹ دیا تھا[1] اسی طرح شہید سید حسن مدرس کا جرأتمندانہ اقدام ہو یا آیۃ اللہ سید ابوالقاسم کاشانی کی تحریک، غرض

---

[1] معتبر تاریخی کتاب " تحریم تنباکو " تحریر حجۃ الاسلام زنجانی

ہر مرحلے پر آپ کو ولایتِ فقیہ ایسی تحریکوں کی راہنمائی کرتے نظر آئے گی۔

● ـــــ علماء اسلام کے ساتھ بین الاقوامی استعماری اور استکباری[1] طاقتوں کی پرانی دشمنی اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام دشمن طاقتیں "ولایت فقیہ" کی حقیقت سے مکمل طور پر آگاہ ہیں کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ یہ ولایت فقیہ ہی ہے جو ان کے مفادات پر کاری ضرب لگا سکتی ہے۔

● ـــــ "ولی فقیہ" کی اطاعت کے بارے میں قرآن مجید اور احادیث معصومین علیہم السّلام کے بیانات اس بات کے گواہ ہیں کہ ولایت فقیہ، تاریخ اسلام کے ساتھ ساتھ چلی آرہی ہے۔

پس معلوم ہوا کہ ولایت فقیہ ایسی چیز نہیں ہے جسے مثلاً "ایران کی آئین ساز اسمبلی" نے ایجاد کیا ہو یا ایران کی انقلابی قوم نے اس کا تصور دیا ہو۔ بلکہ یہ تو اسلام کے ان بنیادی اصولوں میں سے ہے جو زندگی کے تمام شعبوں میں جلوہ گر ہوتے ہیں، چاہے وہ اجتماعی شعبے ہوں یا سیاسی، ثقافتی، اقتصادی اور تعلیمی شعبے، اور کتاب و سنت کی رو سے اسلام میں اس کی جڑیں نہایت ہی گہری ہیں۔

انہی وجوہات کی بنا پر عالم اسلام کے عظیم رہنما اور اسلامی جمہوریہ ایران کے بانی حضرت امام خمینی رضوان اللہ علیہ فرماتے ہیں:

---

[1] کتاب "تاکتیکھای متنوع کمونیسم در راہ مبارزہ با اسلام"

"...... "ولایتِ فقیہ" کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے آئین ساز اسمبلی نے ایجاد کیا ہو، بلکہ یہ تو وہ چیز ہے جسے خود خداوندِ عالم نے ہی ایجاد کیا ہے، وہی رسول اللہ کی ولایت ہی تو ہے اور یہ لوگ رسولِ خدا کی ولایت سے بھی خوف کھاتے ہیں......" [1]

---

[1] علماء اسلام سے امامِ امت حضرت امام خمینی کا اہم خطاب۔

چوتھا سبق

انسانوں کو حکومت کی ضرورت ہے

تمام مخلوقات میں سے صرف انسان ہی ایسی مخلوق ہے جو اکیلے رہ کر زندگی کی چیزیں فراہم نہیں کرسکتا بلکہ مجبوراً اسے اجتماعی صورت میں رہ کر یہ چیزیں فراہم کرنا پڑتی ہیں۔ لہٰذا وہ مجبور ہے کہ دوسرے انسانوں کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرے اور بعض لوگوں کے نظریہ کے مطابق "انسان" مدنی الطبع "ہے" لہٰذا فطری بات ہے کہ وہ انفرادی زندگی سے گریزاں اور اجتماعی زندگی پر مجبور ہے۔ اور یہ اجتماعی زندگی اس وقت فائدہ پہنچا سکتی ہے جب تمام بنی نوع انسان کے درمیان باہمی رابطہ، امن وسلامتی اور ایک دوسرے کے حقوق کا احترام موجود ہو۔

اور یہ چیزیں اس وقت حاصل ہوسکتی ہیں جب ان پر کوئی حکومت ہو۔ تاکہ:

ا: افراد کو ان کے فرائض سے آگاہ اور ان فرائض کی ادائیگی پر آمادہ

کرے اور نیز انفرادی اور اجتماعی فرائض کو معین کرے۔

ب : معاشرے کو، بلندی، کمال اور ترقی کی طرف راہنمائی کرے اور اسے آگے بڑھائے۔

ج : سرکشوں اور باغیوں کو کیفر کردار تک پہنچائے۔

د : سرحدوں کی حفاظت کرے۔

حکومت اور حاکم کے بارے میں اسلام کا نظریہ

اس سلسلے میں ہم حضرت علیؑ اور امام محمد باقرؑ کے فرامین کو نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں :

● —— جب امام اوّل حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام نے سُنا کہ خوارج کہہ رہے ہیں

"لَاحُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ"

"یعنی حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے"

تو آپؑ نے فرمایا :

"کَلِمَةُ حَقٍّ یُرَادُ بِهَا الْبَاطِلُ ،
نَعَمْ اِنَّهُ لَاحُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ وَلٰکِنَّ
هٰؤُلَاءِ یَقُوْلُوْنَ لَا اِمْرَةَ اِلَّا لِلّٰہِ وَاِنَّهُ
لَابُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ اَمِیْرٍ بَرٍّ اَوْفَاجِرٍ

يَعْمَلُ فِيْ إِمْرَتِهِ الْمُؤْمِنُ وَيَسْتَمْتِعُ
فِيْهَا الْكَافِرُ وَيُبَلِّغُ اللّٰهُ فِيْهَا الْأَجَلَ
وَيُجْمَعُ بِهِ الْفَيْئُ وَيُقَاتَلُ بِهِ الْعَدُوُّ
وَتَأْمَنُ بِهِ السُّبُلُ وَيُؤْخَذُ بِهِ
لِلضَّعِيْفِ مِنَ الْقَوِيِّ حَتّٰى يَسْتَرِيْحَ بَرٌّ
وَيُسْتَرَاحَ مِنْ فَاجِرٍ"

(نہج البلاغۃ۔ ترجمہ فیض الاسلام خطبہ ۴۰ صفحہ ۱۱۶)

" بات تو ٹھیک ہے لیکن اس سے مراد غلط لی گئی ہے۔ درحقیقت وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حکومت کی سربراہی کا بھی کسی کو حق حاصل نہیں ہے۔ یعنی کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ حکومت کی باگ ڈور سنبھالے اور لوگوں کے سیاسی اور اجتماعی امور کی نگرانی کرے۔ حالانکہ انسانی معاشرہ اس بات پر مجبور ہے کہ اس کے لیے نیک یا بد حکمران ہو جو معاشرتی ضروریات کو پورا کرے (البتہ ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا کردار ہوتا ہے نیک حکمران معاشرے میں نیکی اور بدکار معاشرے میں برائیوں کے فروغ کا سبب بنتا ہے۔ لہٰذا اسلام نے حاکمیت کا حق صرف اللہ کے نیک بندوں کو دیا ہے)

بہر صورت معاشرے کو ایک سربراہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ:

(۱) ہر شخص کو اپنا صحیح حق مل سکے۔ مومن اپنی اطاعت و عبادت میں مشغول رہے اور کافر بھی اپنے حق سے محروم نہ ہو۔

(۲) معاشرہ سکون کی زندگی بسر کر سکے اور ہر قسم کی بدامنی کی روک تھام کی جاسکے۔

(۳) مالیات اور لگان کو اکٹھا کر کے معاشرے کی بہبود پر خرچ کیا جاسکے۔

(۴) دشمنوں کے ساتھ جنگ کی جاسکے۔

(۵) ڈاکوؤں، راہزنوں، چوروں اور فساد برپا کرنے والوں کی سرکوبی کی جاسکے۔

(۶) طاقت ور سے کمزور کا حق حاصل کیا جاسکے۔

(۷) نیک لوگ برے افراد کے شر سے محفوظ رہ سکیں۔

مندرجہ بالا بیان میں ایسے نکات کو بیان کیا گیا ہے جو ہر معاشرے کی ضرورت ہیں اور ایک حکمران ایسی ضروریات پوری کر سکتا ہے۔

● —— عَنْ جَابِرِ بْنِ يَزِيْدَ الْجُعْفِيْ قَالَ قُلْتُ لِاَبِيْ جَعْفَرٍ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيِّ الْبَاقِرِ: لِاَيِّ شَيْءٍ يُحْتَاجُ اِلَى النَّبِيِّ وَالْاِمَامِ؟ فَقَالَ لِبَقَاءِ الْعَالَمِ عَلٰى صَلَاحِهِ. وَذٰلِكَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَرْفَعُ الْعَذَابَ

عَنْ اَهْلِ الْاَرْضِ اِذَا كَانَ فِيهَا نَبِيٌّ
اَوْ اِمَامٌ - قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ وَمَا
كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيهِمْ وَ
قَالَ النَّبِيُّ اَلنُّجُوْمُ اَمَانٌ لِاَهْلِ السَّمَآءِ
وَاَهْلُ بَيْتِيْ اَمَانٌ لِاَهْلِ الْاَرْضِ -
فَاِذَا ذَهَبَتِ النُّجُوْمُ اَتٰى اَهْلَ السَّمَآءِ
مَا يُكْرِهُوْنَ وَاِذَا ذَهَبَ اَهْلُ بَيْتِيْ
اَتٰى اَهْلَ الْاَرْضِ مَا يُكْرِهُوْنَ - يَعْنِيْ
بِاَهْلِ بَيْتِهِ الْاَئِمَّةَ الَّذِيْنَ قَرَنَ
اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ طَاعَتَهُمْ بِطَاعَتِهٖ
فَقَالَ يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا
اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ
وَهُمُ الْمَعْصُوْمُوْنَ الْمُطَهَّرُوْنَ الَّذِيْنَ
لَا يُذْنِبُوْنَ وَلَا يَعْصُوْنَ وَهُمُ الْمُؤَيَّدُوْنَ

الْمُوَفَّقُوْنَ الْمُسَدَّدُوْنَ بِهِمْ یَرْزُقُ اللّٰهُ
عِبَادَهٗ وَبِهِمْ تَعْمُرُ بِلَادُهٗ وَبِهِمْ یُنْزِلُ
الْمَطَرَ مِنَ السَّمَآءِ وَبِهِمْ یُخْرِجُ
بَرَکَاتِ الْاَرْضِ وَبِهِمْ یُمْهَلُ اَهْلُ
الْمَعَاصِیْ وَلَا یُعَجَّلُ عَلَیْهِمْ بِالْعُقُوْبَةِ
وَالْعَذَابِ لَا یُفَارِقُهُمْ رُوْحُ الْقُدُسِ
وَلَا یُفَارِقُوْنَهٗ وَلَا یُفَارِقُوْنَ الْقُرْاٰنَ
وَلَا یُفَارِقُهُمْ صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَیْهِمْ
اَجْمَعِیْنَ۔"

(علل الشرائع صفحہ ۱۲۳)

"پانچویں امام حضرت محمد باقر علیہ السلام سے جابر بن یزید جعفی نے سوال کیا کہ:

انسانی معاشرے کو نبی اور امام کی کیوں ضرورت ہوتی ہے؟
تو امامؑ نے فرمایا:

یہ ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ معاشرہ ہمیشہ صحیح سالم رہے اور امن و سلامتی کی زندگی بسر کرے (چونکہ امامؑ اور

نبی صحیح اسلامی سیاست اور جہانداری کے اصولوں کو بروئے کار لاکر معاشرے کو اپنے صحیح خطوط پر چلانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے امن وسلامتی وجود میں آتی ہے۔)

خداوند عالم نبی اور امام کی وجہ سے لوگوں پر عذاب نازل نہیں کرتا (کیونکہ ان کا وجود رحمت اور سبب ہدایت ہوتا ہے) اسی لیے قرآن فرماتا ہے۔ جب تک اے پیغمبرؐ آپ ان لوگوں کے درمیان موجود ہیں خدا انھیں عذاب نہیں کرے گا۔ اور آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ ستارے آسمان میں رہنے والوں کے لیے اور میرے اہل بیتؑ زمین میں رہنے والوں کے لیے جائے پناہ اور امن وامان کا سبب ہیں جس طرح ستاروں کے چلے جانے سے اہلِ آسمان مشکلات میں گرفتار ہو جائیں گے اسی طرح میرے اہلِ بیت کے چلے جانے سے اہلِ زمین مشکلات میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اور میرے اہلِ بیت وہی لوگ ہیں کہ خدا نے جن کی اطاعت لوگوں پر فرض قرار دی ہے اور اپنی اطاعت کے ساتھ ساتھ ان کی اطاعت کا ذکر فرمایا ہے :

"اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" (سورہ نساءؑ آیہ ۵۹)

پھر امام باقر علیہ السلام نے وضاحت کے طور پر فرمایا :

"اولی الامر" سے مراد معصوم امام ہیں جو کسی بھی (چھوٹے بڑے) گناہ کا ارتکاب نہیں کرتے۔ خداوند عالم کی تائید

ان کے شامل حال ہوتی ہے وہ خداوند کریم کے نزدیک اس قدر معزز اور محترم ہیں کہ خدا نے انھیں اپنے فیض و برکات کا وسیلہ بنا دیا ہے، یعنی ان لوگوں کی وجہ سے خداوند متعال اپنے بندوں کو رزق عطا فرماتا ہے، شہروں کو آباد کرتا ہے بارش برساتا ہے اور انہی (معصومینؑ) کی وجہ سے زمین اپنی برکتیں ظاہر کرتی ہے۔ اور انہی کی وجہ سے خداوندِ عالم، گناہگاروں کو سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ انھیں مہلت دیتا ہے ممکن ہے کہ وہ اپنے کیے پر نادم ہوں اور راہ راست کی طرف لوٹ آئیں!!

امامؑ کے آبِ وحی میں ڈھلے ہوئے ان کلمات سے چند نکات پیدا ہوتے ہیں:

- معاشرے کو ہمیشہ رہبر کی ضرورت ہے اور جب تک انسان روئے زمین پر موجود ہے ہمیشہ رہبر کا محتاج ہے۔
- معاشرے کی اس بنیادی ضرورت کو ایک ایسے حکمران کے ذریعہ پورا کیا جا سکتا ہے جو پاک طینت، لائق اور شائستہ ہو۔

(لہٰذا اسلامی ریاست کی حاکمیت کے لیے ضروری ہے کہ اس کی سربراہی یا تو خود پیغمبر کے ہاتھ میں ہو یا امام کے اور یا ولی فقیہ کے ہاتھ میں ہو، اس کے علاوہ کوئی اور شخص اس کی اہلیت نہیں رکھتا۔)

- معاشرے میں حکمران کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ لہٰذا

اسلام نے بھی اس امر کی طرف خاص توجہ فرمائی ہے اور حکمران کے لیے خاص شرائط مقرر کی ہیں۔

● ہمیشہ انسانِ کامل "خدا کے فیض" کا واسطہ ہوتے ہیں جنکی وجہ سے آفات دور ہوتی ہیں اور برکتیں نازل ہوتی ہیں۔

پانچواں سبق

حکمران کی خصوصیات علی بن ابی طالبؑ کی نظر میں

ذیل میں ہم باب مدینۃ العلم، خلیفۃ الرسول، امیر المومنین علی بن ابیطالب علیہ السلام کے چند گوہر بار فرامین کو بیان کریں گے جو آپؑ نے حکومت اور حاکم کے بارے میں ارشاد فرمائے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ لائق حاکم کی حکومت معاشرے پر کیا اثرات مرتب کرتی ہے اور نالائق حاکم کی حکومت کیا اثرات چھوڑتی ہے۔ تاکہ "اسلامی حکومتوں" کے سربراہوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوں۔

ا : جب لائق انسان بر سرِ اقتدار ہو :

● —— "دَولَۃُ الکَرِیمِ تُظْہِرُ مَنَاقِبَہٗ"

"شریف انسان کی حکمرانی اس کی اچھائیوں کو برملا کرتی ہے۔"

یعنی معاشرے پر شرافت کی حکمرانی ہوتی ہے کیونکہ برتن سے وہی چھلکتا ہے جو اس میں ہوتا ہے۔

- "دَوْلَۃُ الْعَاقِلِ یَحِنُّ اِلَی الْوُصْلَۃِ"

"عقلمند اور باشعور انسان کی حکومت میں مقصود تک پہنچنے کی امید اور آرزو پیدا ہوتی ہے۔"
معاشرے کے غریب عوام کو انصاف ملنے کی توقع ہوتی ہے۔

- "دَوْلَۃُ الْعَادِلِ مِنَ الْوَاجِبَاتِ"

"واجبات میں سے ہے کہ حکومت کی سربراہی عادل شخص کے پاس ہو۔"
یعنی واجب ہے کہ حکومت کی سربراہی کے لیے عادل شخص کو منتخب کیا جائے۔

- "دَوْلَۃُ الْاَکَارِمِ مِنْ اَفْضَلِ الْغَنَائِمِ"

"شرفاء کی حکمرانی بہترین غنیمت ہے۔"
(غررالحکم۔ باب الدال)

- "زَکوٰۃُ الْقُدْرَۃِ الْاِنْصَافُ"

"اقتدار کی زکوٰۃ عدل وانصاف ہے"

- "زَکوٰۃُ الْجَاہِ بَذْلُہٗ"

"عظمت اور بزرگی کی زکوٰۃ دوسروں کی مشکلات حل کرنا ہے"
(غررالحکم باب الخاء)

- "خَیْرُ السِّیَاسَاتِ الْعَدْلُ"

"عدل و انصاف بہترین سیاست ہے۔"

● —— "خَیْرُ الْاُمَرَاءِ مَنْ کَانَ عَلٰی نَفْسِہٖ اَمِیْرًا"

"بہترین حاکم وہ ہے جو اپنی ذات پر حکمران ہو۔"

(غرر الحکم۔ باب الخاء)

ب : جب نالائق انسان برسرِ اقتدار ہو :

● —— "شر الولاۃ من یخافہ البریٔ"

"بدترین حاکم وہ ہے جس سے بے گناہ لوگ ڈریں۔"

(غرر الحکم۔ باب الشین)

● —— "شَرُّ الْاُمَرَاءِ مَنْ ظَلَمَ رَعِیَّتَہٗ"

"بدترین حکمران وہ ہے جو اپنی رعایا پر ظلم کرے۔"

(غرر الحکم۔ باب الشین)

مختلف نظام ہائے حکومت

یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ انسانی معاشرے کے لیے حکومت کا ہونا ضروری ہے۔ یہاں پر ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مختلف انسانی معاشروں میں مختلف نظام ہائے حکومت چل رہے ہیں۔

خدا پرست اور خدا پر یقین رکھنے والے معاشروں (تھیزم) میں

حاکمیت کا حق صرف خالق کائنات کو حاصل ہے اور وہاں پر تھیوکریسی نظام حکومت چل رہا ہے لیکن " اومانزم" نظریات کے حامل معاشرے میں حاکمیت کا حق صرف انسان کو حاصل ہے کیونکہ اس معاشرے کے نظریہ کے مطابق انسان ہی سب کچھ ہے۔

البتہ اس نظریہ کے حامیوں کی دو قسمیں ہیں :

ایک قسم وہ ہے جو "فرد" کو اصل قرار دیتے ہیں۔

اور دوسری قسم وہ ہے جو " اجتماع" کی اصل کے قائل ہیں۔

اور اس دوسری قسم کے لوگ کچھ تو ایسے ہیں جو اکثریت کو حکومت کرنے کا حق دیتے ہیں اور (ڈیموکریسی) کے قائل ہیں۔

دوسرے وہ جو اقلیت کی اکثریت پر حکومت کرنے کے قائل ہیں اور (اناریشزم) کے طرفدار ہیں۔

(لیکن اسلامی نکتہ نظر سے حکومت دراصل خدا کی طرف سے ہے اور فرد یا افراد کو خدا کی ذات سے قرب اور بُعد کی نسبت سے اہمیت حاصل ہے)

ڈیموکریسی کیا ہے؟

ڈیموکریسی ـــــ دو کلموں ، ایک " ڈیمو" یعنی عوام اور دوسرے "کریسی" یعنی حکومت سے مرکّب ہے۔

اور ابراہام لنکن نے " ڈیموکریسی " کی تعریف یوں کی ہے :

" عوام کے ذریعے ـــــ عوام کے اوپر ـــــ
عوام کی حکومت " [۱]

---

[۱] فرہنگ سیاسی داریوش آشوری

اگر توجہ کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس تعریف میں دو اہم عناصر دکھائی دیتے ہیں۔ ایک حکومت اور دوسرے عوام۔ اور بس۔ تیسری کسی چیز کا نام ونشان دکھائی نہیں دیتا۔ نہ تو خدا کا ذکر ہے ——— نہ آخرت کا تذکرہ ہے ——— نہ سزا نہ جزا ———

——— جو کچھ ہے عوام ہیں۔

انسان کے ہاتھوں انسان کی زندگی خواہ کتنی ہی بہتر کیوں نہ ہو پھر بھی اس مادی دنیا میں محدود اور چند روزہ ہے۔

بنا بریں ڈیموکریسی کا منشا صرف اور صرف مادّی ہے۔ اور اسی دنیا تک محدود ہے اور خدا پرستی کے نکتۂ نظر سے قطعاً سازگار نہیں ہے۔

اور پھر ڈیموکریسی طرز حکومت میں کسی اچھائی یا بُرائی اور نیکی یا بدی کا معیار صرف عوام کی رضامندی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ چند سال پہلے برطانیہ کے دارالعوام کے سامنے عوام کی بہت بڑی تعداد نے ایک زبردست مظاہرہ کے دوران مرد کی مرد کے ساتھ شادی کرنے کو قانونی شکل دینے کا مطالبہ کیا۔

پارلیمنٹ نے اس پر بحث کرنے کے بعد اسے قانون کی صورت میں منظور کر دیا حتیٰ کہ کلیساؤں کو حکمنامہ جاری کیا کہ :

" اس عقد کا باقاعدہ صیغہ پڑھا جائے۔"

لیکن اسلامی نکتۂ نظر سے اگر کائنات کے تمام انسان بھی اکٹھے ہو کر کسی ایک بھی حلال کو حرام یا حرام کے حلال کرنے کا مطالبہ کریں تو کسی بھی صورت میں ان کا مطالبہ نہیں مانا جا سکتا۔ کیونکہ اچھائی اور بُرائی کا معیار حق و باطل (اور خدا کی رضامندی) ہے نہ کہ عوام کی مرضی۔ کیونکہ :

" حَلَالُ مُحَمَّدٍ حَلَالٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ وَحَرَامُهٗ حَرَامٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ "

" دینِ محمدؐ میں جو چیز حلال ہے وہ قیامت تک حلال ہے اور جو چیز حرام ہے وہ قیامت تک حرام ہے۔"

" ..... عَنْ زُرَارَةَ قَالَ سَأَلْتُ اَبَا عَبْدِاللّٰهِ عَنِ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ فَقَالَ حَلَالُ مُحَمَّدٍ حَلَالٌ اَبَدًا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ وَحَرَامُهٗ حَرَامٌ اَبَدًا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ لَا یَکُوْنُ غَیْرُهٗ وَلَا یَجِیْئُ غَیْرُهٗ۔"

(اصول کافی جلد اول صفحہ ۵۷)

" زرارہ سے روایت ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے حلال اور حرام کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا: حضرت محمدؐ کا حلال کردہ قیامت تک کے لیے حلال ہے اور حرام کردہ قیامت تک حرام ہے۔ اس کے علاوہ نہ تو اور کچھ ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی اور چیز اس کی جگہ لے سکتی ہے۔"

چھٹا سبق

اسلامی حکمران کے فرائض

اسلامی حکمران پر فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ فرد یا معاشرے کی ناجائز خواہشات کے مقابلے میں ڈٹ جائے۔

جیسا کہ خدا فرماتا ہے:

● ــــــ وَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ "[1]

" جو کام تمھارے ذمہ لگایا گیا ہے اس کی سختی کے ساتھ پابندی کرو اور ان لوگوں کی (نفسانی اور حیوانی) خواہشات

---

[1] سورۂ شوریٰ ۴۲۔ آیت ۱۵

کی پیروی مت کرو۔"

● —— وَاَنِ احْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَلَاتَتَّبِعْ اَھْوَآءَھُمْ " [1]

" جو کچھ خدا نے نازل فرمایا ہے اس کے مطابق فیصلہ کرو نہ کہ ان (لوگوں) کی مرضی کے مطابق۔

● —— فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَلَاتَتَّبِعْ اَھْوَآءَھُمْ " [2]

جو کچھ خدا نے تم پر نازل فرمایا ہے اسی کے مطابق فیصلہ کرو اور ان کی خواہشاتِ نفسانی کی اتباع نہ کرو۔"

اسلامی نکتہ نظر سے نہ تو فرد کی اصلیت کی بات ہے اور نہ ہی اجتماع کی بلکہ حق کو معیار قرار دیا گیا ہے اور قانون کی بالادستی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اور خداوندِ عالم پیغمبروں کو بھیج کر اور کتابیں نازل کرکے انسانی معاشرے پر حکومت کرتا ہے۔ اور اس طرح کی حکومت کی سربراہی زمانے کے تقاضوں کے مطابق یا تو پیغمبر کے پاس ہوتی ہے یا امام اور یا ولی فقیہ کے پاس ہوتی ہے۔

ان حکمرانوں کا فلسفہ وجودی، خدا کی حکومت کا اجرا اور خدائی قوانین کا نفاذ نیز افرادِ بشر کو حق اور حقیقت کی طرف راہنمائی ہوتا ہے۔ گویا ان خدائی نمائندوں

---

[1] سورۂ مائدہ۔ آیت ۴۹

[2] سورۂ مائدہ۔ آیت ۴۸

کے اصلی فرائض دو طرح کے ہوتے ہیں:

(۱) — خدا کے احکام لوگوں تک پہنچانا۔

"وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ" [۱]

"ہم نے آپ کی طرف ذکر (قرآن) نازل کیا ہے تاکہ لوگوں کو یہ احکام وضاحت کے ساتھ بیان کریں۔"

(۲) — لوگوں پر حکمرانی اور ان کی قیادت:

"اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰکَ اللّٰہُ"

"ہم نے تم پر برحق کتاب اس لیے نازل کی ہے کہ جس طرح خدا نے تمھاری ہدایت کی ہے اسی طرح لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔"

(سورۂ نسار ۴ - آیت ۱۰۵)

اور مندرجہ ذیل آیت کے ذریعے لوگوں کو ان کی اتباع اور پیروی کا حکم دیا گیا ہے:

"یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" [۲]

---

۱ — سورۂ نحل - آیت ۴۴

"اے ایماندارو! خدا کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اور جو تم میں سے صاحبانِ امر ہوں ان کی اطاعت کرو۔"

(سورۂ نساء۴-آیت ۵۹)

اور " مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا " [1]

" ہاں جو تم کو رسولؐ دے دیں وہ لے لیا کرو اور جس سے منع کریں اس سے باز رہو۔"

اور نیز " مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ " [2]

" جس نے رسولؐ کی اطاعت کی تو اس نے خدا کی اطاعت کی۔"

ان تمام معروضات کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اسلامی نکتۂ نظر سے :

۱۔ معاشرے کیلیے حکومت کا ہونا ضروری ہے

" اِنَّهُ لَابُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ اَمِيْرٍ بَرٍّ اَوْ فَاجِرٍ " [3]

---

[1] سورۂ حشر ۵۹-آیت ۷ [2] سورۂ نساء ۴ آیت ۸۰

[3] نہج البلاغہ۔ ترجمہ فیض الاسلام خطبہ ۴۰

" یقیناً لوگوں کے لیے ایک امیر ہونا ضروری ہے خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا۔"

۲۔ معاشرے پر حکمرانی ہر شخص کا کام نہیں

کیونکہ معاشرے میں حاکم کو ایک نہایت ہی اہم مقام حاصل ہوتا ہے اور اس کا کردار افراد کے لیے بہت ہی موثر ہوتا ہے۔

" اَلنَّاسُ بِاُمَرَائِهِمْ اَشْبَهُ بِاٰبَائِهِمْ۔"

" لوگ اپنے حکام کے ساتھ زیادہ شباہت رکھتے ہیں بہ نسبت اپنے آباؤ اجداد کے۔"

(بحار الانوار قدیم جلد ۷ صفحہ ۱۲۹)

نیز: اَمَّا الْاِمْرَةُ الْبَرَّةُ فَيَعْمَلُ فِيهَا التَّقِيُّ وَاَمَّا الْاِمْرَةُ الْفَاجِرَةُ فَيَتَمَتَّعُ فِيهَا الشَّقِيُّ۔" [1]

" اگر حکومت صالح ہو تو اس میں نیک اور پرہیزگار اعمالِ نیک انجام دیتے ہیں اور اگر حکومت فاجر ہو تو

---

[1] نہج البلاغہ ترجمہ فیض الاسلام خطبہ ۴۰

برُے اور شقی افراد فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

۳- انسان پر اللہ کی حکومت:

ولایتِ فقیہ کی حاکمیت:

ولایت فقیہ کا سرچشمہ ولایتِ امام اور ولایتِ امام کا سرچشمہ ولایتِ رسول اللہؐ اور ولایتِ رسولؐ کا سرچشمہ حقیقی اور خدائی ولایت ہوتی ہے۔

ولایتِ فقیہ اور شوریٰ

جس طرح ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ امامِ معصومؑ کی غیبت کے زمانے میں اسلامی معاشرے کی قیادت اور سربراہی جامع الشرائط فقیہ کے ذمہ ہوتی ہے۔

اب یہ ولایت (خواہ ایک شخص سے متعلق ہو یا چند اشخاص کے ساتھ اس کا تعلق ہو) اپنے خطیر اور سنگین فریضہ کی ادائیگی کے لیے خداوندِ عالم کے فرمان

"وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ" اور "أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ"[۱]

سے استفادہ کرتی ہے۔

البتہ یہ مشورہ ایسی صورت میں ہوتا ہے جب کسی چیز کے متعلق خداوندِ عالم کا صاف اور صریح حکم موجود نہ ہو۔ جیسا کہ امیر المومنین علی علیہ السلام نے طلحہ اور زبیر کے اعتراض کے جواب میں فرمایا ہے (جب انھوں نے کہا تھا کہ فلاں چیز

۱۔ سورۂ شوریٰ ۴۲ آیت ۳۸

کے بارے میں آپ نے ہم سے مشورہ کیوں نہیں کیا تھا ؟)

" اگر کوئی ایسا حکم ہوا جس کے بارے میں نہ تو کتاب خدا میں اور نہ ہی سنّت رسولؐ میں کوئی واضح بیان موجود ہو تو تمھارے ساتھ مشورہ کروں گا۔"

خلاصہ یہ کہ :

- ——— صلاح اور مشورہ ایسے امور میں کیا جائے گا جن کے بارے میں کوئی واضح حکم اور قانون موجود نہ ہو۔
- ——— لوگوں سے مشورہ ایسے امور میں کیا جائے گا جن کے بارے میں وہ فیصلہ دینے کا اختیار بھی رکھتے ہوں اور یہ اس صورت میں ہوگا جب خدا کی طرف سے کوئی صاف اور صریح حکم موجود نہ ہو۔

" وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ " [۱]

" جب خدا اور رسولؐ کسی چیز کے بارے میں فرمان صادر کریں تو کسی مومن مرد یا عورت کے لیے شائستہ نہیں ہے کہ وہ اس بارے میں اپنی مرضی کے مطابق عمل کریں اور خدا و رسولؐ کے فرمان کی طرف کوئی توجہ نہ دیں۔"

---

[۱] سورۂ احزاب ۳۳ - آیت ۳۶

- مشورہ ایسے لوگوں سے کیا جائے گا جو اس کی اہلیت رکھتے ہوں نہ کہ ہر شخص سے۔

ملّت کی نگرانی اور ولایتِ فقیہ

امت کے تمام افراد ایک جسم کی صورت میں ہوتے ہیں جس کا دِل دورانِ غیبتِ امامِ معصومؑ "ولایتِ فقیہ" ہوتا ہے اور معاشرے میں افراد کو اعضاءِ بدن کے ساتھ تشبیہ دی جاسکتی ہے جو سب کے سب "مغز" کی خدمت کے لیے آمادہ ہوتے ہیں اور بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

" وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِالْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰۤى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ " [۱]

" جب امنِ عامہ یا لوگوں کے خوف کا کوئی مسئلہ پیش آتا ہے تو (ذمہ دار افراد تک پہنچانے سے پہلے) اسے خوب خوب پھیلاتے ہیں (یہ ان لوگوں پر طنز ہے جو افواہیں پھیلاتے ہیں یا مملکت اور ملت کے رازوں کو چھپانے میں احتیاط

---

[۱] سورۂ نساءؑ - آیت ۸۳

سے کام نہیں لیتے۔) اگر وہ اس مسئلہ کو رسولؐ یا اولی الامر تک پہنچائیں تو جو لوگ صاحبانِ بصیرت ہیں اور اس بارے میں مصلحت سمجھتے ہیں کوئی بہتر تدبیر سوچیں گے۔

بقول مولائے کائنات علی ابن ابیطالب علیہ السلام:

"نَحْنُ النُّمْرُقَةُ الْوُسْطٰی بِهَا يَلْحَقُ التَّالِيْ وَاِلَيْهَا يَرْجِعُ الْغَالِيْ۔"[1]

"ہم حق کا معیار ہیں پیچھے رہ جانے والوں کو ہم سے مل جانا چاہیئے اور آگے چلے جانے والوں کو لوٹ آنا چاہیئے۔"

پس بنابریں عوام کا فرض بنتا ہے کہ نہ تو وہ ولایت فقیہ سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں اور نہ ہی اس سے پیچھے رہ جائیں اور نہ ہی اس کے فرامین سے سرپیچی کریں۔

اسی طرح اسلامی راہبر کا بھی فرض ہے کہ نہ تو وہ لوگوں سے جدا ہو اور نہ ہی ان سے مخفی رہے۔

امام امیر المومنین علیہ السلام مالک اشتر کے نام خط میں فرماتے ہیں:

" (ہمیشہ رعایا کے ساتھ رہو) ان سے پردہ کرکے نہ رہو اور اس پردے میں زیادہ دیر تک نہ چھپے رہو۔ تمھیں چاہیئے کہ ہمیشہ لوگوں سے براہِ راست رابطہ قائم کیے رکھو اور ان سے دوری اختیار نہ کرو۔ کیونکہ اس طرح حکمراں ان چیزوں سے محروم ہو جاتا ہے جن کو لوگ

---

[1] نہج البلاغہ۔ کلمات قصار۔ ۱۰۶

براہ راست حاکم تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ
بہت سی اطلاعات اور معلومات سے بے خبر رہتا ہے۔
اور یہ بات صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں وہ
بسا اوقات صحیح کو غلط سے جدا نہیں کر سکتا۔" [۱]

جب صورت حال اس طرح ہو جائے تو نہ تو فقیہ معاشرے
کے حالات سے بے خبر رہتا ہے اور نہ ہی عوام اپنے فریضہ سے غافل ہوتے
ہیں۔ بلکہ وہ ہمیشہ میدان عمل میں موجود رہتے ہیں۔

۱۔ نہج البلاغہ۔ ترجمہ فیض الاسلام صفحہ ۱۰۲۴

قیامت کے دن کی قسم!
اور بیدار اور سرزنش کرنے والے
ضمیر کی قسم!
کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہم اس کی پراگندہ ہڈیوں
کو دوبارہ اکٹھا نہیں کریں گے؟
(نہیں ایسا ہرگز نہیں)
ہم اس بات پر قادر ہیں۔ حتیٰ کہ اس کی
انگلیوں (کی لکیروں) کو روزِ اوّل کی طرح
دوبارہ بنانے پر قادر ہیں۔

سورۂ قیامت۔ آیت ۱ تا ۴

مُعَاد
یا
قِیَامَت

فہرست اسباق

پہلا سبق	معاد یا قیامت	۱۶۵
دوسرا سبق	معاد، اور زندگی کا مفہوم	۱۷۳
تیسرا سبق	قیامت کی عدالت کا نمونہ خود انسان کے اپنے اندر موجود ہے	۱۸۱
چوتھا سبق	معاد، فطرت کی روشنی میں	۱۸۶
پانچواں سبق	قیامت، عدالت کی روشنی میں	۱۹۳
چھٹا سبق	دنیا میں قیامت کا نمونہ	۱۹۹
ساتواں سبق	معاد اور پیدائش کا فلسفہ	۲۰۵
آٹھواں سبق	روح کی بقاء اور قیامت	۲۱۲
نواں سبق	جسمانی اور روحانی معاد	۲۲۰
دسواں سبق	بہشت، دوزخ اور اعمال کا مجسم ہونا	۲۲۶

پہلا سبق

معاد یا قیامت

موت زندگی کا آغاز ہے یا انجام؟

بہت سے لوگ موت سے ڈرتے ہیں، آخر کیوں؟

موت ہمیشہ انسان کی آنکھوں کے سامنے ایک "وحشتناک ہیولے" کی مانند مجسم چلی آرہی ہے۔ اس کے تصور نے زندگی کی شیرینیوں کو تلخیوں میں تبدیل کیا ہوا ہے۔

لوگ نہ صرف موت کے نام سے ڈرتے ہیں بلکہ قبرستان کے نام سے بھی گھبراتے ہیں لہٰذا موت کے خطرناک تصور کو بھلانے کے لیے خوبصورت اور مزین قبریں تیار کرتے ہیں۔

دنیا کے مختلف ادبیات میں اس وحشت کے آثار مکمل طور پر واضح ہیں۔ کوئی تو اسے "موت کا ہیولا" کہتا ہے اور کوئی "موت کا آہنی پنجہ"

کسی نے اسے "موت کے سیلاب" سے تعبیر کیا ہے اور کسی نے کسی اور نام سے۔

اب ہمیں اس بات کا سراغ لگانا ہوگا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ انسان اس قدر موت سے ہراساں ہے اور اس کے تصوّر سے لرز اُٹھتا ہے؟

اور پھر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو نہ صرف موت سے نہیں ڈرتے بلکہ مسکرا کر موت کا استقبال بھی کرتے ہیں آخر ایسا کیوں ہے؟

بہت سے لوگ ایسے ہیں جنھیں "آبِ حیات" اور "اکسیر جوانی" کی تلاش رہتی ہے اور وہ ہمیشہ اس تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔

جبکہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو والہانہ طور پر جہاد کے لیے میدانِ جنگ کی طرف جاتے ہیں اور مسکرا کر موت کو اپنی آغوش میں لینے کے لیے تیار رہتے ہیں اور بسا اوقات وہ طولانی زندگی سے شاکی ہوتے ہیں اور ہمیشہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کب اپنے معشوق ومحبوب (خدا) کی ملاقات کا شرف حاصل کرتے ہیں؟

اس کا واضح ثبوت آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ پیر وجوان کس ذوق وشوق کے ساتھ محاذِ جنگ پر جاتے ہیں؟ اور کیونکر جان بر کف شہادت کا استقبال کرتے ہیں؟

موت سے ڈرنے کی اصل وجہ

جب ہم اس موضوع پر غور کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس خوف وہراس کی صرف دو وجوہات ہیں:

ا۔ موت کو فنا سے تعبیر کرنا

انسان فطری طور پر "عدم" یا "نیستی" سے گھبراتا ہے اور اس سے گریز

کرتا ہے۔ بیماری سے اس لیے گھبراتا ہے کہ وہ تندرستی کے لیے "نیستی" ہے۔

تاریکی سے ڈرتا ہے کہ وہ نور اور روشنی کی "نیستی" ہے۔

فقر و تنگدستی سے خوف کھاتا ہے کہ وہ دولت اور ثروت کی نیستی اور نابودی ہے۔

حتیٰ کہ بعض اوقات خالی گھر سے اسے وحشت لگتی ہے اور جنگل و بیابان میں اسے ڈر لگتا ہے کیونکہ وہاں پر "کوئی نہیں" ہوتا۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ خود مُردے سے اسے خوف آتا ہے اور ایک رات تنہائی میں اس کے ساتھ نہیں گزار سکتا۔ حالانکہ جب وہ زندہ تھا تو اس سے کسی قسم کا ڈر نہیں لگتا تھا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان "عدم" یا "نیستی" سے کیوں خوف کھاتا ہے؟

تو اس کا سبب ظاہر ہے اور وہ یہ کہ:

"ہستی" کو "ہستی" کے ساتھ مربوط کر دیا گیا ہے اور "وجود" کو "وجود" سے آشنائی حاصل ہے۔ "وجود" - "عدم" سے ہرگز آشنا نہیں ہے۔ اور "ہستی" نے "نیستی" کی "صورت" کو نہیں دیکھا۔

جب حقیقت حال یہ ہو تو نیستی سے اجنبیت ایک فطری امر ہے۔

اگر ہم موت کو "زندگی کی نیستی اور نابودی" سے تعبیر کریں اور گمان کریں کہ مرنے کے ساتھ ہی سب کچھ کا خاتمہ ہو جاتا ہے پھر تو ہمارا حق بنتا ہے کہ ہم اس سے خوف کھائیں، حتیٰ کہ اس کے نام بلکہ تصور سے بھی گھبرا جائیں۔ کیونکہ موت ہمارا سب کچھ چھین کرلے جاتی ہے۔

لیکن اگر موت کو ایک نئی زندگی کا پیش خیمہ تصور کریں اور حیاتِ جاودانی کا سر آغاز سمجھیں تو ظاہر ہے کہ نہ صرف اس سے وحشت نہیں کھائیں گے

بلکہ جو لوگ پاک و پاکیزہ اور سرخرو ہو کر اس کی طرف قدم بڑھاتے ہیں انھیں مبارکباد بھی دیں گے۔

۲۔ سیاہ کارنامے

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو موت کو فنا، عدم اور نیستی سے تعبیر نہیں کرتے اور مرنے کے بعد ایک نئی زندگی کے آغاز کا بھی انکار نہیں کرتے لیکن اس کے باوجود موت سے ڈرتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کا نامۂ اعمال اس قدر سیاہ اور تاریک ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد ملنے والی دردناک سزاؤں سے ڈرتے ہیں۔

ان کا موت سے ڈرنا صحیح بھی ہے اور ان کا حق بنتا ہے کہ وہ اس سے ڈریں اور وحشت کھائیں۔ وہ لوگ ایسے خطرناک مجرموں کی مانند ہیں جو جیل سے باہر آنے سے گھبراتے ہیں۔ کیونکہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب بھی جیل سے باہر لائے جائیں گے۔ فوراً موت کے منہ میں پہنچا دیے جائیں گے۔ ایسے خطرناک مجرم ہمیشہ جیل کی سلاخوں سے چمٹے رہتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ آزادی سے نفرت کرتے ہیں بلکہ اس لیے کہ ایسی آزادی کا انجام سزائے موت ہے۔

بعینہٖ بدکار لوگ ہیں جو اپنی ارواح کو جسم کے تنگ قفس سے آزاد ہونے کو اگلے جہان میں ملنے والی سزاؤں کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ جن خطرناک جرائم اور ظلم و ستم کا ارتکاب کر چکے ہیں انھیں مرنے کے فوراً بعد ان کی سزاؤں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

لہٰذا وہ موت سے ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں۔

لیکن جو لوگ نہ تو موت کو "فنا" سمجھتے ہیں اور نہ ہی ان کا نامۂ اعمال

سیاہ اور تاریک" ہے وہ موت سے کیوں گھبرائیں ؟

اس میں شک نہیں کہ ایسے لوگ بھی زندگی کو تہہ دل سے چاہتے ہیں لیکن زندگی کا حقیقی مزہ انھیں مرنے کے بعد نئی زندگی میں نظر آتا ہے لہٰذا اپنے پروردگار کی رضا میں انھیں جو موت آتی ہے خندہ پیشانی کے ساتھ اس کا استقبال کرتے ہیں۔

۲ دو مختلف نظریے

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ لوگ دو طرح کے ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ جو اکثریت پر مشتمل ہے، موت سے بیزار اور متنفر ہے۔

اور دوسرا وہ جو شہادت جیسے ہدف اور مقصد کے حصول میں آنے والی موت کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہیں اور مسکرا کر اس کا استقبال کرتے ہیں۔

اور یا کم از کم اتنا ضرور ہوتا ہے کہ جب انھیں اپنی طبیعی زندگی ختم ہوتی نظر آتی ہے تو اپنے وجود میں کسی قسم کے رنج و ملال کا احساس نہیں کرتے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ موت کے بارے میں دو مختلف نظریے ہیں:

ایک نظریہ تو ان لوگوں کا ہے جو یا تو مرنے کے بعد دوسری زندگی پر ایمان نہیں رکھتے اور یا ایمان تو رکھتے ہیں لیکن اچھی طرح انھیں اس کا یقین نہیں ہے۔ لہٰذا وہ موت کی گھڑی کو ہر چیز سے الوداع کہنے کی گھڑی سمجھتے ہیں۔

اور آپ جانتے ہیں کہ ہر چیز کو خیرباد کہنا کتنا دردناک ہوتا ہے ؟ اور نور و روشنی کے مکان سے نکل کر تاریک اور بھیانک گھر میں منتقل ہونا کتنا وحشتناک ہے ؟ اس دنیا سے منتقل ہو کر دوسری دنیا میں جانا ان کے لیے ایسا ہوتا

ہے جیسے کسی مجرم کو جیل سے نکال کر عدالت میں پیش کیا جاتا ہو اور اس کے جرائم کی اسناد نہایت ہی وحشت انگیز اور ہولناک ہوں۔

لیکن جو لوگ موت کو نئی زندگی سمجھتے ہیں ان کے لیے اس دنیا سے چلا جانا ایسا ہوتا ہے جیسے وہ ایک محدود اور تاریک ماحول سے نکل کر ایک نہایت ہی وسیع، روشن اور غیر محدود جہان کی طرف جا رہے ہوں یا ایک چھوٹے سے تنگ پنجرے سے نکل کر لامحدود فضا میں پرواز کے لیے روانہ ہو رہے ہوں۔

یا ایک ایسے معاشرے جو لڑائی جھگڑے، جنگ و جدال، کشمکش، تنگ نظری، بے انصافی، کینہ پروری اور دشمنی کا مرکز ہے سے نکل کر ان تمام آلودگیوں سے پاک معاشرے کی طرف جا رہے ہوں۔

جب ان لوگوں کا نظریہ یہ ہو تو وہ موت سے کیونکر وحشت کھائیں؟ اور کیوں نہ حضرت علی علیہ السلام کے اس جملے کو اپنے لیے مشعل راہ بنائیں؟

"لَابْنُ اَبِی طَالِبٍ آنَسُ بِالْمَوْتِ
مِنَ الطِّفْلِ بِثَدْیِ اُمِّہٖ"

"خدا کی قسم ابو طالب کا بیٹا موت سے اس
شیر خوار بچے کے مقابلہ میں زیادہ مانوس ہے جو
اپنی ماں کے پستانوں کے ساتھ مانوس ہوتا ہے"

یا اس فارسی شاعر کی مانند یہ نغمہ گا کر موت سے ہم آغوش ہونے کے لیے بڑھے گا

مرگ اگر مرد است بگو نزد من آی
تا در آغوشش بگیرم تنگ تنگ

من ز او جانی ستانم جاودان

او زمن دلقی ستاند رنگ رنگ

" یعنی اگر موت میں کوئی مردانگی ہے تو اسے کہو کہ
میرے پاس آئے تاکہ میں اسے گرمجوشی کے ساتھ
اپنی آغوش میں لے سکوں۔ میں اس سے ہمیشہ
کی زندگی حاصل کروں گا اور وہ مجھ سے رنگارنگ
بوریا۔"

اگر تاریخِ اسلام میں ہمیں امام حسینؑ اور ان کے باوفا ساتھیوں جیسے افراد ملتے ہیں جو جوں جوں موت کے نزدیک ہوتے جاتے تھے تو ان کے چہرے کی شادابی اور تازگی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اور دیدار یار کے شوق میں پھولے نہیں سماتے تھے تو یہ بے مقصد نہیں تھا۔

اور اسی فلسفہ کے تحت علی بن ابیطالب علیہ السلام کا وہ تاریخی جملہ ہے کہ جب آپؑ پر ابن ملجم نے سجدہ کی حالت میں تلوار کے ساتھ وار کیا تو آپؑ نے فرمایا:

" فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ "

" رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا ہوں۔"

ظاہر ہے کہ اس جملے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ انسان خود کو خطرات میں ڈال دے اور زندگی جیسی عظیم خدائی نعمت کی کوئی قدر نہ کرے اور اسی زندگی کے ذریعے زندگی کے عظیم مقاصد تک پہنچنے کی کوشش نہ کرے۔ بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ زندگی سے صحیح فائدہ اٹھائے۔ جب عظیم مقاصد کے حصول کے لیے قدم اٹھایا ہو تو موت کے آنے پر کسی قسم کی گھبراہٹ اور خوف وہراس کا اظہار نہ کرے۔

؟ سوالات

① لوگ موت سے کیوں ڈرتے ہیں ؟ اس کے اسباب بیان کیجیے ؟

② کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ مسکرا کر موت کا استقبال کرتے ہیں ؟ اور راہ خدا میں شہادت کے عاشق ہیں ؟

③ موت کے لمحہ کو کس چیز سے تشبیہ دی جاسکتی ہے ؟ مرتے وقت باایمان افراد اور بدکار لوگوں کی کیا کیفیت ہوتی ہے ؟

④ آپ نے اپنی زندگی میں ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو موت سے نہ ڈرتے ہوں ؟ ان کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں ؟

⑤ موت کے بارے میں علی علیہ السلام کا کیا نظریہ ہے ؟

دوسرا سبق

معاد، اور زندگی کا مفہوم!

اگر صرف اس جہان کی زندگی کو کافی سمجھ لیا جائے اور ایک دوسرے جہان کو مدنظر نہ رکھا جائے تو زندگی بے معنی اور بے مقصد ہو کر رہ جائے گی۔ اور بعینہٖ ایسے ہوگی جیسے جنین (شکم مادر میں موجود بچّہ) کی زندگی کا دورہ اس دنیا کے بغیر تصور کر لیا جائے۔

جو بچہ شکم مادر میں موجود ہے اور اس تاریک و محدود زندان میں کئی ماہ گزار دیتا ہے۔ اگر اس وقت اس کے پاس عقل ہو اور اپنی اس زندگی کے بارے میں غور کرے تو یقیناً حیران ہوگا اور اپنے سے سوال کرے گا:

میں کس لیے اس تاریک زندان میں مقیّد ہوں؟

کس لیے میں پانی اور خون میں تیرتا ہوں؟

آخر میری زندگی کا کیا انجام ہوگا؟

میں کہاں سے آیا ہوں ؟ میرے آنے کا مقصد کیا ہے ؟
لیکن اگر اسے آگاہ کیا جائے کہ یہ دور اس کا ایک مقدماتی دور ہے جہاں اس کے اعضاء بدن بن رہے ہیں ۔ اس کی طاقت کے ذرائع مہیا ہو رہے ہیں تاکہ وہ درپیش آنے والی ایک عظیم دنیا میں مکمل طور پر تیار ہو کر جائے اور نو ماہ مکمل ہونے کے بعد اسے اس تاریک اور محدود مقام سے آزادی کا حکم ملے گا جس سے ایک ایسی عظیم دنیا میں پہنچے گا جس میں نیرّ تاباں، ماہِ درخشاں، سرسبز و شاداب درخت اور مختلف قسم کے دریا و سمندر رہوں گے اور ہر طرح کی نعمت وہاں پر مہیا ہو گی ۔

وہ جب یہ جواب سنے گا تو یقیناً سکھ کا سانس لے گا اور کہے گا کہ اب پتہ چلا کہ اس تنگ و تاریک جگہ پر میرا فلسفہ وجودی کیا ہے ؟ یہ تو ایک مقدماتی مرحلہ ہے ۔ یہ تو پرواز کے لیے آشیانہ ہے اور یا ایک دانش گاہ تک پہنچنے کے لیے ابتدائی کلاس ہے ۔

لیکن اگر جنین (شکم مادر میں موجود بچہ) کی زندگی کا رابطہ اس جہان سے منقطع ہو جائے تو اس کے لیے سب کچھ تاریک اور بے معنی ہو جائے گا ۔ شکمِ مادر اس کے لیے ایک وحشتناک زندان اور بے مقصد سفر ہو کر رہ جائے گا ۔

اِس دنیا اور اُس جہان کا باہمی رابطہ بھی بعینہٖ اسی طرح ہے ۔
ہم ستر اسی سال تک اس دنیا میں ہاتھ پاؤں مارتے رہیں ۔ ایک عرصے تک تو ناپختہ کار اور ناتجربہ کار رہیں اور جب پختہ بھی ہو جائیں اور کچھ تجربہ بھی حاصل ہو جائے تو زندگی کا خاتمہ ہو جائے ، ایک مدت تک علم اور دانش حاصل کرتے رہیں اور جب معلومات کے لحاظ سے پختہ ہو جائیں تو بڑھاپے کی گرفت میں آجائیں اور پھر موت ہمارا سب کچھ ہم سے چھین کر لے جائے ۔

توکیا ہماری زندگی کا مقصد صرف کھانا، پینا، پہننا اور سونا ہے؟
آسمان کا یہ نیلگوں شامیانہ ــــــ زمین کا یہ زمردین فرش
علم و دانش کے یہ عظیم گہوارے ــــــ تجربہ حاصل کرنے کے لیے یہ تجربہ گاہیں
ــــــ یہ بزرگوار اور باعظمت استاد اور مربی ــــــ سب کچھ کھانے
پینے، پہننے اور سونے کے لیے ہیں؟
یہیں سے دنیا کا کھوکھلا پن ان لوگوں کے لیے یقینی ہو جاتا ہے
جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ کیونکہ نہ تو وہ ان چھوٹی چھوٹی اور معمولی سی چیزوں کو زندگی
کا مقصد سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی موت کے بعد ایک اور جہان پر یقین رکھتے ہیں۔
لہٰذا ایسا اوقات دیکھنے میں آتا ہے کہ اس کھوکھلی اور بے مقصد
زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ایسے لوگ خودکشی کر لیتے ہیں۔
لیکن اگر اس بات کا یقین کر لیا جائے کہ:
"دنیا آخرت کی کھیتی ہے، آج جو کچھ یہاں بویا
جائے گا اس کا محصول کل ہمیشہ کی زندگی اور
حیات جاودانی کے دور میں ملے گا۔"
یا یہ یقین کر لیا جائے کہ
یہ دنیا ایک یونیورسٹی ہے جہاں پر معلومات حاصل کرنے
کے وسائل مہیا ہیں تاکہ اگلی دنیا میں ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔
اور یا یہ دنیا ایک گزرگاہ اور پل کی مانند ہے جس سے گزر کر
منزل مقصود تک جا پہنچیں گے۔
تو ایسی صورت میں دنیاوی زندگی کھوکھلی اور بے معنی نہیں ہوگی بلکہ ایک
دوسری پائیدار اور جاویدان و ابدی زندگی کا مقدمہ سمجھی جائے گی جس کے لیے یہاں پر

جس قدر بھی جدوجہد کی جائے کم ہوگی۔
گویا قیامت پر ایمان، انسان کی زندگی کو ایک باقاعدہ مفہوم بخشتا ہے اور اسے ہر قسم کے اضطراب، خوف اور پریشانی سے نجات دلاتا ہے۔

قیامت پر ایمان تربیت کیلئے مؤثر عامل ہے

مذکورہ دلائل کے علاوہ، آخرت کی عظیم عدالت پر ایمان ہماری موجودہ دور کی زندگی کے سنوارنے کے لیے بہت ہی مؤثر ہے۔
فرض کیجیے کسی ملک میں اس بات کا اعلانِ عام کر دیا جائے کہ سال کے ایک مقرر دن میں جو شخص بھی جس جرم کا ارتکاب کرے گا اس سے نہ تو کوئی مواخذہ کیا جائے گا اور نہ ہی اسے کوئی سزا ملے گی۔ ہر شخص مطمئن ہو کر ارتکاب جرم کر سکتا ہے کوئی سرکاری یا غیر سرکاری شخص اس سے کسی قسم کی پوچھ گچھ یا روکنے کا حق نہیں رکھتا عدالتوں کو ان جرائم کے کیس کی سماعت کا کوئی حق نہیں۔
ایسی صورت میں آپ ہی بتائیں کہ اس دن ملک پر کیا گزرے گی؟
اسی لیے کہا جاتا ہے کہ قیامت پر ایمان گویا ایک ایسی عظیم عدالت پر ایمان ہوتا ہے جس کی نظیر اس دنیا میں نہیں ملتی۔
اس عدالت کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہیں:

- ایسی عدالت ہے جہاں پر نہ تو کوئی سفارش چل سکتی ہے اور نہ ہی "تعلقات" کام آسکتے ہیں۔ وہاں پر صرف "قانون" کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔ اور نہ ہی جھوٹے ثبوت مہیا کر کے "حاکم" کو دھوکہ دے کر چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔
- ایسی عدالت ہے جس میں دنیاوی عدالتوں کی طرح تکلفات

سے کام نہیں لیا جائے گا۔اسی لیے فیصلے کی سماعت طولانی نہیں ہوگی۔پلک جھپکنے کی دیر سے بھی کم مدت میں فیصلہ سنا دیا جائے گا اور بالکل صحیح فیصلہ ہوگا۔

- ایسی عدالت ہے جہاں "ملزم" پر فرد جرم عائد کرنے کے لیے ثبوت کے طور پر اس کے اپنے اعمال ہوں گے جو مجسم ہو کر سامنے آجائیں گے۔اور اپنے مرتکب کے ساتھ ایسے تعلق کو ظاہر کریں گے کہ کسی قسم کے انکار کی گنجائش باقی نہیں رہ جائے گی۔
- ایسی عدالت ہے جس میں انسان کے اپنے اعضاء از قبیل آنکھ، کان، زبان، ہاتھ، پاؤں بلکہ وہ زمین اور در و دیوار گواہی دیں گے جہاں پر کسی گناہ یا ثواب کو انجام دیا گیا ہے اور جب قدرتی آثار کی صورت میں انسان کے اعمال گواہی دیں گے تو کسی قسم کے انکار کی گنجائش باقی نہیں رہ جائے گی۔
- ایسی عدالت ہوگی جس کا حاکم (فیصلہ کرنے والا) خود خدا ہوگا جو ہر چیز سے باخبر، ہر کسی سے بے نیاز اور ہر ایک سے زیادہ عادل ہے۔
- ان سب باتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ حقیقت سب سے زیادہ اہم ہے کہ وہاں پر ملنے والی اکثر سزائیں مقرر کردہ نہیں ہیں بلکہ انسان کے اپنے اعمال ہوں گے جو اسے دکھ دیتے رہیں گے یا نعمتوں اور آسائشوں سے مالامال کر دیں گے۔

ایسی عدالت پر ایمان انسان کو اس کمالِ انسانیت کے درجے تک پہنچا دیتا ہے کہ وہ علی علیہ السلام کے اس جملہ کو اپنے لیے طرز زندگی کے طور پر اپناتا ہے کہ:

"خدا کی قسم میرے لیے ساری رات نرم بستر پر بسر کرنے کی بجائے کانٹوں پر گزار دینا اور میرے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑ کر کوچہ و بازار میں پھرایا جانا مجھے اس بات سے زیادہ پسند ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں ایسی حالت میں پیش ہوں کہ خدا کے کسی بندے پر ظلم اور کسی کا حق غصب کیا ہوا ہو۔" [۱]

یہ قیامت کی عدالت پر ایمان ہی تو ہے جو انسان کو ایسا اقدام کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ جب اس کا بھائی بیت المال سے دوسروں کی نسبت اپنے مقرر کردہ وظیفے میں اضافے کا مطالبہ کرتا ہے تو لوہا گرم کر کے بھائی کے نزدیک لے جاتا ہے۔ جب وہ اس گرمی سے چیخ اٹھتا ہے تو اسے کہتا ہے:

"تم دنیاوی آگ کی معمولی گرمی سے چیخ اٹھے ہو، لیکن اپنے بھائی کو جہنم کی آگ میں جھونکنے سے نہیں گھبراتے جس کے شعلوں کو خداوند ذوالجلال کے قہر و غضب نے بھڑکایا ہوا ہے۔" [۲]

آیا ایسا ایمان رکھنے والے شخص کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے؟

آیا اس کے ضمیر کو رشوت کے ذریعے خریدا جا سکتا ہے؟

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ نمبر ۲۲۴

۲۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ نمبر ۲۲۴

آیا اسے لالچ اور طمع یا دھمکیوں کے ذریعے راہ راست سے ہٹا کر ظلم کے ارتکاب پر مجبور کیا جا سکتا ہے ؟

قرآن مجید فرماتا ہے : جب مجرمین اور گناہگار لوگ اپنے نامۂ اعمال کو دیکھیں گے تو وہ پکار اٹھیں گے :

"مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا"

" یہ کیسی کتاب ہے جس میں تمام چھوٹے بڑے گناہ درج ہیں ؟ " [۱]

اس طرح سے انسان کے اندر فرض شناسی کا جذبہ موجزن ہوتا ہے اور اس میں ذمہ داری کا ایسا احساس پیدا ہو جاتا ہے جو اسے ہر قسم کی لغزشوں گمراہیوں اور مظالم کے ارتکاب سے باز رکھتا ہے ۔

---

[۱] سورہ کہف ۔ آیت ۴۹

سوالات

۱ ـــــ اگر اس محدود اور چند روزہ زندگی کے بعد ایک اور جہان نہ ہوتا تو کیا ہو جاتا ؟

۲ ـــــ معاد اور قیامت کے منکر لوگ خودکشی کا ارتکاب کیوں کرتے ہیں ؟

۳ ـــــ اس دنیا کی عدالتوں اور آخرت کی عدالت میں کیا فرق ہے ؟

۴ ـــــ آخرت پر ایمان انسان کے اعمال پر کیا اثر کرتا ہے ؟

۵ ـــــ امیرالمومنینؑ نے اپنے بھائی عقیل سے کیا فرمایا ؟ وہ کیا چاہتے تھے ؟ اور علیؑ نے کیا جواب دیا ؟

تیسرا سبق

قیامت کی عدالت کا نمونہ خود انسان کے اپنے اندر موجود ہے

جو لوگ اس محدود جہان میں اسیر ہیں اُن کے لیے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا اور قیامت کے دن عظیم عدالت کا منعقد ہونا ایک نئی چیز ہے۔ خداوند عالم نے اس عدالت کا ایک چھوٹا سا نمونہ اسی دنیا میں ہمیں دکھا دیا ہے جس کا نام "ضمیر کی عدالت" ہے۔ یاد رہے یہ ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔

ہم اس کو ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں:

انسان اس دنیا میں جو غلط کام انجام دیتا ہے، اس کے لیے اسے کئی عدالتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

سب سے پہلی عدالت تو اپنی تمام کمزوریوں کے ساتھ یہی عام انسانی عدالتیں ہیں۔ گو کہ ایسی عدالتیں جرائم کی کمی میں معمولی اثر رکھتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے

کہ ان کی بنیاد ہی کچھ اس طرح رکھی گئی ہے جن سے صد در صد انصاف کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔

اگر غلط قوانین اور ناشائستہ ججوں کا ان میں عمل دخل ہو تو نتیجہ ظاہر ہے کہ رشوت، پارٹی بازی، سفارش، خصوصی تعلقات، سیاسی اثر و رسوخ اور اسی طرح کی ہزاروں خرابیاں ایسی ہوتی ہیں جو صحیح فیصلہ نہیں ہونے دیتیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ "ان کا نہ ہونا ان کے ہونے سے بہتر ہے"، تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ ایسی "عدالتیں" بارسوخ لوگوں کے غلط مقاصد کو پورا کرنے کا ذریعہ ہوتی ہیں۔

اور اگر فرض کر لیا جائے کہ ان کے قوانین بھی منصفانہ ہوتے ہیں اور جج حضرات بھی صاحبانِ فکر و تقویٰ ہوتے ہیں تو اس کے باوجود بھی بہت سے مجرم سزا پانے سے بچ جاتے ہیں کیونکہ وہ جرم کا ارتکاب اس مہارت کے ساتھ کرتے ہیں کہ جرم کے ثبوت کا کوئی ذریعہ نہیں چھوڑتے۔ یا جج کے سامنے ملزم کا ریکارڈ ایسے انداز میں پیش کیا جاتا ہے کہ اس کے لیے کوئی صحیح فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح انصاف کے قوانین بے اثر ہو کر رہ جاتے ہیں۔

دوسری عدالت جو مذکورہ عدالت کی نسبت زیادہ حساس اور مؤثر ہوتی ہے وہ "مکافاتِ عمل" کی عدالت ہے۔

کیونکہ ہمارے اعمال کا نتیجہ ایسا ہوتا ہے جو جلد یا بدیر ہمارے دامنگیر ہو جاتا ہے۔ اگر یہ ایک عام فارمولا نہ بھی ہو پھر بھی کم از کم بہت سے مقامات پر ضرور صادق آتا ہے۔

مثلاً آپ نے ایسے حکمران دیکھے ہوں گے جنھوں نے ظلم و ستم کی بنیاد رکھی اور جو کچھ ظلم کر سکتے تھے کیے۔ لیکن آخر میں جو جال انھوں نے دوسروں

کے لیے بُنا تھا خود ہی اس میں پھنس گئے۔ اوران کے اعمال نے ان کے لیے ردِ عمل کا ایسا اظہار کیا کہ وہ صفحہ ہستی سے ہمیشہ کے لیے مٹ گئے اور سوائے لعنت اور نفرت کے اپنے لیے کوئی اور یادگار نہ چھوڑ سکے۔

تیسری عدالت جو مذکورہ دونوں عدالتوں کی نسبت زیادہ حساس اور قوی ہے وہ "ضمیر کی عدالت" ہے۔

درحقیقت جس طرح منظومۂ شمسی کا محیر العقول اور باعظمت نظام ایک ایٹم (ذرّہ) میں سماجاتا ہے اسی طرح قیامت کی عظیم عدالت کا نمونہ بھی انسان کی ایک چھوٹی سی جان میں موجود ہوتا ہے۔

کیونکہ انسان کے اندر ایک پراسرار قدرت ہوتی ہے جسے فلاسفہ "عقلِ عملی" کہتے ہیں۔ قرآن "نفس لوامہ" کہتا ہے اور موجودہ دور میں اسے "ضمیر" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جونہی انسان نے کوئی غلط کام کیا یہ عدالت تشکیل ہوجاتی ہے اور کسی قسم کے شور شرابے کے بغیر اپنا کام شروع کردیتی ہے۔

صحیح اصولوں کی بنا پر کیس کی سماعت کرتی ہے اور نفسیاتی لحاظ سے فوراً فیصلہ سنا دیتی ہے اور بسا اوقات یہ فیصلہ ایسا ہوتا ہے جس سے مجرم کے باطن کو ہمیشہ کوڑے لگتے رہتے ہیں اور اس کی روح کو شکنجوں میں ایسا جکڑ دیتا ہے کہ وہ موت کو زندگی پر ترجیح دیتا ہے اور خودکشی پر مجبور ہوجاتا ہے اور اپنے وصیت نامہ میں لکھ دیتا ہے کہ اگر میں خودکشی کر رہا ہوں تو اس کا سبب روحانی عذاب سے چھٹکارا پانا ہے۔

اس عدالت کا جج، گواہ، منتظم اور تماشائی صرف ایک ہی چیز ہے اور وہ انسان کا اپنا "ضمیر" ہوتا ہے۔ جو مقدمے کی سماعت کرتا ہے، گواہی دیتا ہے، فیصلہ

سناتا ہے اور اس پر عملدر آمد کراتا ہے۔

یہ عدالت ان دنیاوی عدالتوں کے بالکل برعکس ہوتی ہے جن میں ایک مقدمہ کئی سال تک طول پکڑ جاتا ہے لیکن ضمیر کی عدالت میں مقدمے کی سماعت پر پلک جھپکنے کی دیر لگتی ہے بلکہ اس سے بھی کم۔

البتہ یہ اور بات ہے کہ

غفلت کے پردے ہٹنے میں کچھ دیر لگ جائے۔ لیکن غفلت کے پردے ہٹتے ہی فیصلہ فوراً سنا دیا جاتا ہے۔ اور یہ کہ اس عدالت کا فیصلہ صرف ایک ہی مرحلے میں ہو جاتا ہے۔ جس کے لیے نہ تو اپیل کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی وکیل، عدالت عالیہ اور دوسرے تکلفات کی۔

اور اس عدالت کی سزا، دنیاوی عدالتوں کی سزاؤں سے مختلف ہوتی ہے، جس میں ظاہری طور پر نہ تو جیل ہوتی ہے اور نہ ہی کوڑے۔ نہ پھانسی کا تختہ ہوتا ہے اور نہ ہی آگ کی بھٹی۔

لیکن بسا اوقات انسان باطنی طور پر اس قدر جلتا اور کڑھتا رہتا ہے اور اس طرح ضمیر کے قید خانے میں بند ہو جاتا ہے کہ یہ دنیا اپنی تمام وسعتوں کے باوجود اس پر وحشتناک اور خطرناک جیل کی کال کوٹھری سے بھی زیادہ تنگ ہو جاتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ عدالت، دنیاوی عدالتوں کی مانند نہیں بلکہ قیامت کی عدالت کا ایک مختصر سا نمونہ ہوتی ہے۔ اور اس کی اس قدر عظمت ہے کہ خدا نے قرآن مجید میں اس کے نام سے قسم اٹھائی ہے اور قیامت کی عدالت کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔

خدا فرماتا ہے:

"لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ ○ وَ
لَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ○
اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ
عِظَامَهٗ ○ بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی
اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ ○"

"قیامت کے دن کی قسم اور بیدار اور سرزنش کرنے
والے ضمیر کی قسم، کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہم اس
کی پراگندہ ہڈیوں کو دوبارہ اکٹھا نہیں کریں گے؟
(نہیں ایسا ہرگز نہیں) ہم اس بات پر قادر ہیں حتیٰ کہ
اس کی انگلیوں (کی لکیروں) کو (جو، ہر شخص کے لیے
پہچان کا ایک ذریعہ ہوتی ہیں) روزِ اوّل کی طرح
دوبارہ بنانے پر قادر ہیں۔"

(سورہ قیامت۔ آیت ۱ تا ۴)

سوالات

(۱) انسان پر واقعاً کتنی عدالتوں میں مقدّمہ چل سکتا ہے ؟

(۲) پہلی عدالت کی خصوصیات اور نام بتائیں ؟

(۳) دوسری عدالت کی کیا خصوصیات ہیں ؟

(۴) تیسری عدالت کی کیا خصوصیات ہیں ؟

چوتھا سبق

معاد، فطرت کی روشنی میں

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ "خود شناسی" انسان کی فطرت اور سرشت میں داخل ہے اور اگر انسان کے آگاہ اور ناآگاہ ضمیر کی کاوشوں کو غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ انسان فطرتاً ایک ماوراء الطبیعۃ ذات پر ایمان رکھتا ہے جس نے خاص مقصد اور منصوبے کے تحت اس جہان کو پیدا کیا ہے۔

اور پھر یہ چیز صرف توحید اور خداشناسی پر ہی منحصر نہیں بلکہ تمام اصولِ دین اور فروعِ دین میں بھی یہی اصول کارفرما ہونا چاہیے۔ ورنہ "تشریع" اور "تکوین" کے درمیان ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکے گی۔

(خوب غور کیجیے)

اگر ہم اپنے دل کا خوب غور سے جائزہ لیں اور اپنی روح کی گہرائیوں میں سے اٹھنے والی آواز کو سنیں تو دل کے کانوں میں یہ آواز آئے گی

کہ یہ زندگی مرنے کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ موت، عالمِ بقار کی جانب کھلنے والا ایک دروازہ ہے۔

اسی حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کے لیے مندرجہ ذیل نکات پر توجہ ضروری ہے:

۱۔ بقار کے ساتھ محبّت

اگر یہ حقیقت ہے کہ انسان نیستی اور فنا کے لیے پیدا ہوا ہے تو اسے فنا کا عاشق ہونا چاہیے تھا۔ اور زندگی کے خاتمے پر اسے موت سے لذّت محسوس کرنا چاہیے تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ موت (بمعنی فنا و نیستی) کا تصور انسان کے لیے نہ صرف خوش آئند نہیں بلکہ وہ ہر ممکن اس سے بھاگنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

طولانی عمر کی تمنا ـــــ اکسیرِ جوانی کی تلاش ـــــ اور آبِ حیات کی جستجو، اس حقیقت کی علامتیں ہیں۔

بقار کے ساتھ انسان کی اس قدر محبت اس بات کی دلیل ہے کہ ہم بقار کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ اگر ہم فنا کے لیے پیدا ہوتے تو بقا کے لیے اس محبت کا نام ونشان نہ ہوتا۔

ہمارے اندر تمام بنیادی محبتیں ہمارے وجود کو مکمل کرتی ہیں اسی طرح بقار کے ساتھ محبت بھی ہمارے وجود کی تکمیل کرتی ہے۔

یاد رہے کہ "معاد" کی بحث کو ہم خداوند حکیم و دانا کے وجود کو تسلیم کرنے کے بعد بیان کر رہے ہیں۔ کیونکہ اس نے جو کچھ بھی ہمارے جسم و جان میں پیدا کیا ہے باقاعدہ حساب وکتاب کے تحت پیدا کیا ہے۔ اسی بنا پر انسان کی بقار کے ساتھ محبت اور تعلق بھی یقیناً کسی حساب وکتاب کے تحت ہونا چاہیے۔

اور وہ اس جہان کے بعد ایک اور جہان کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔

۲۔ گزشتہ قوموں میں قیامت کا تصوّر

تاریخِ بشریت جس طرح اس بات کی شاہد ہے کہ گزشتہ قوموں میں قدیم ایام سے مذہب پر ایمان موجود چلا آرہا ہے اسی طرح "مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے" پر بھی ان کا ایمان قدیم زمانے سے قائم ہے۔

قدیم انسانوں بلکہ قبل از تاریخ کے انسانوں کے جو آثار ملتے ہیں خصوصاً مُردوں کی قبور کی طرزِ ساخت، مُردوں کے دفن کا انداز، یہ سب اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر ایمان رکھتے تھے۔

اس راسخ عقیدے کو جو ہمیشہ سے انسان کے ساتھ چلا آرہا ہے سادہ نہیں سمجھنا چاہیئے اور یا ایک عادت یا کسی کے سکھانے کا نتیجہ نہیں جاننا چاہیئے۔

جب کوئی تاریخی عقیدہ بنی نوع انسان کے درمیان راسخ چلا آرہا ہو تو وہ فطری ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ انسان کی فطرت اور سرشت ہی ہوتی ہے جو زمانے کی تبدیلیوں کے باوجود اپنی جگہ برقرار رہتی ہے ورنہ عادات اور رسومات تو زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔

مثلاً فلاں نوعیت کا لباس۔ یا تو عادت ہے اور یا آداب و رسومات کا جزو، جو حالات، ماحول اور زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

لیکن بچے کے ساتھ اس کی ماں کی محبت ایک غریزہ اور سرشت ہوتی ہے جو ماں کی فطرت میں داخل ہوتی ہے لہٰذا نہ تو معاشرتی تبدیلیوں کی آندھیاں اس مقدس شعلے کو بجھا سکتی ہیں اور نہ ہی زمانے کی گردش اس پر فراموشی کا غبار

ڈال سکتی ہے۔

صاحبانِ علم و دانش کہتے ہیں کہ:

"تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانے کے لوگ بھی
کسی نہ کسی صورت میں مذہب کے پابند تھے......
.... کیونکہ ان میں سے جب کوئی شخص مرجاتا تھا تو
وہ ایک خاص انداز سے اسے دفن کرتے تھے اور اس
کے کام کرنے کے اوزار و آلات بھی اسی کے ساتھ
دفن کر دیتے تھے جس سے ان کے ایک اور دنیا
پر عقیدے کا ثبوت ملتا ہے۔" [۱]

اس سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں نے مرنے کے بعد ایک اور زندگی کو قبول کیا ہوا تھا۔

یہ اور بات ہے کہ اس سلسلہ میں وہ ایک غلط فہمی کا شکار تھے اور وہ یہ کہ وہ سمجھتے تھے کہ مرنے کے بعد ملنے والی زندگی بھی ٹھیک اسی دنیاوی زندگی کی مانند ہے جہاں پر اوزار اور آلات کی ضرورت ہوتی ہے۔

۳- اندرونی عدالت

اندرونی عدالت جسے "ضمیر" بھی کہا جاتا ہے معاد کے فطری ہونے پر ایک اور دلیل ہے اور جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ہمارے اندر ایک عدالت ہوتی ہے جو ہمارے اعمال کا محاسبہ کرتی ہے اور نیک کاموں کے بدلے میں ہمیں جزا دیتی ہے

---

[۱] جامعہ شناسی" کینگ" صفحہ ۱۹۲

جس سے ہم ذہنی سکون محسوس کرتے ہیں۔ ہمارے دل وجان میں ایک ایسی روحانی لذت کا احساس ہوتا ہے جو کسی قلم یا زبان کے ذریعے قابل بیان نہیں ہے۔

اور بُرے کاموں، خاص کر بڑے گناہوں کے ارتکاب پر ہمیں ایسی سزا دیتی ہے جس سے زندگی کا مزا تلخ اور جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔

کئی مرتبہ دیکھنے میں آتا ہے کہ قتل جیسے بھیانک جرم کا ارتکاب کرنے والے بہت سے مجرم جو قانون کی گرفت سے بچ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن بہت ہی جلد وہ اپنے آپ کو عدالت میں پیش کر دیتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ ضمیر کی عدالت کے شکنجوں میں جکڑ چکے ہوتے ہیں اور اس سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ یہ عمل انجام دیتے ہیں۔

جب انسان اس باطنی عدالت کو دیکھتا ہے تو سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جب خود میرے چھوٹے سے وجود میں ایک "عدالت" موجود ہے تو اس قدر عظیم اور وسیع وعریض جہان کے لیے کسی قسم کی کوئی عدالت نہ ہو؟

یہ کیونکر ممکن ہے؟

بنا بریں ان تین فطری طریقوں سے قیامت، معاد اور مرنے کے بعد ایک دوسری زندگی پر اعتقاد کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔

(۱) —— بقاء کے ساتھ محبت

(۲) —— قدیم الایام سے انسان کے اندر دوسری زندگی پر ایمان

(۳) —— انسان کے باطن میں عدالتِ قیامت کے مختصر نمونے کا وجود۔

؟ سوالات

① فطری اور غیر فطری امور کو کس طرح پہچانا جا سکتا ہے ؟

② انسان بقار کے ساتھ محبت رکھتا ہے اس کی کیا دلیل ہے ؟ اور بقار کے ساتھ محبت معاد کے فطری ہونے کی کس طرح دلیل بن سکتی ہے ؟

③ آیا گزشتہ اقوام بھی معاد پر ایمان رکھتی تھیں ؟ دلیل پیش کریں ؟

④ "ضمیر کی عدالت" انسان کو کس طرح سزا دیتی ہے ؟ اس کے کچھ نمونے بیان کریں ؟

⑤ ضمیر کی عدالت اور قیامت کی عظیم عدالت کے درمیان کیا رابطہ ہے ؟

پانچواں سبق

قیامت، عدالت کی روشنی میں

اگر کائنات کے نظام اور تخلیق کے قوانین پر تھوڑا سا بھی غور و فکر کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کائنات اور تخلیق کے ہر ہر مرحلے پر قانون کی حکمرانی ہے اور ہر چیز اپنی جگہ پر موزوں ہے۔

انسانی جسم میں یہ منصفانہ نظام اس قدر مناسب ہے کہ اس میں معمولی سی تبدیلی بھی بیماری یا موت کا سبب بن سکتی ہے۔

مثال کے طور پر آنکھ، دل اور دماغ کی کچھ اس طرح بناوٹ کی گئی ہے کہ ہر چیز صحیح طور پر اور ضروری اندازے کے مطابق ترتیب دی گئی ہے۔

نظم و عدالت کا یہ قانون صرف انسانی جسم پر ہی حکمفرما نہیں بلکہ تمام کائنات پر اس کی فرمانروائی ہے کہ:

"بِالْعَدْلِ قَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ"

"عدل ہی کے ذریعے زمین و آسمان اپنی جگہ برقرار ہیں۔"

ایک ایٹم اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ اس جیسے لاکھوں ایٹم سوئی کی نوک پر اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ آپ تصور تو کریں کہ اس (ایٹم) کی بناوٹ کس قدر منظم اور صحیح اندازے کے مطابق ہے کہ وہ لاکھوں سال تک زندہ رہ سکتا ہے۔

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس پر عدل کا قانون حاکم ہے۔ اور الیکٹرونز و پروٹونز کو اس توازن کے ساتھ رکھا گیا ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

گویا کائنات کی چھوٹی سے چھوٹی چیز سے لیکر بڑے سے بڑے اجسام میں عدل کا یہ قانون کارفرما ہے۔ تو کیا انسان اس قانون سے مستثنٰی ہے؟

کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز تو عدل کے نظام میں مربوط ہو لیکن انسان کو اس قانون سے مستثنٰی قرار دے دیا گیا ہو کہ جس بےنظمی، بے عدالتی اور ظلم کا ارتکاب چاہے کرتا پھرے اس سے کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔

یا نہیں ——— ؟

بلکہ اس میں کوئی نکتہ پنہاں ہے ——— ؟

اختیار اور ارادے کی آزادی

حقیقت یہ ہے کہ انسان اور دوسری مخلوقات کے درمیان ایک بنیادی فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ

انسان آزاد ارادے اور اختیار کا مالک ہے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ خدا نے اسے آزاد پیدا کیا ہے اور ہر قسم کے فیصلے کا اختیار اسے دیا ہے کہ وہ جو کچھ چاہے کرتا رہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر وہ آزاد نہ ہوتا تو کبھی بھی درجہ کمال تک نہ پہنچ سکتا اور یہی چیز اس کے معنوی اور اخلاقی کمال کی ضمانت ہے۔

مثال کے طور پر اگر نیزے کی نوک سے انسان کو مجبور کیا جاتا کہ وہ غریبوں کی مدد کرے اور ایسے کام انجام دے جس سے معاشرے کو فائدہ پہنچے۔ اس طرح سے یہ نیک کام سر انجام تو ضرور پا جاتے لیکن ایسا کام کرنے والے شخص کو کوئی انسانی اور اخلاقی کمال نصیب نہ ہوتا۔

جبکہ اس کے برعکس اگر اس کا ایک فیصد بھی اپنی مرضی اور ارادے و اختیار سے انجام دے تو اسی اندازے کے مطابق وہ اخلاقی اور روحانی کمال کی جانب قدم بڑھائے گا۔

بنا بریں معنوی اور اخلاقی کمال کے حصول کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان اپنے ارادے میں مکمل آزاد اور خود مختار ہو اور اپنے ہی پاؤں سے چل کر یہ راستہ خود طے کرے، نہ کہ بہ امر مجبوری ایسے کام کرے۔ اور کائنات کی دوسری مخلوقات کی طرح اپنی حرکت و سکوت میں مجبور رہو۔

لہٰذا اگر خداوند عالم نے انسان کو ارادے کی آزادی اور اختیار جیسی عظیم نعمت سے نوازا ہے تو اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہ اس عظیم مقصد کی جانب گامزن ہو۔

البتہ یہ نعمت اس پھول کی مانند ہے جس کے چاروں طرف کانٹے اُگے ہوں "پھول" سے مراد خدا کی یہ عظیم نعمت ہے اور کانٹوں سے مراد آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھانا اور ظلم و گناہ سے آلودہ ہونا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ خدا میں یہ قدرت ہے کہ اگر کوئی شخص ظلم و ستم کا ارتکاب کرے تو خدا فوراً اُس کو ایسی مصیبت میں مبتلا کر دے کہ وہ کبھی

اس گناہ کے ارتکاب کا تصور بھی نہ کرے۔ اس کے ہاتھ ٹوٹے، آنکھیں اندھی اور زبان گونگی کردے۔ اور اس طرح پھر کبھی وہ آزادی سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے اور گناہ کا ارتکاب نہ کرے۔

لیکن ایسی صورت میں اس کی پرہیز گاری اور تقویٰ ایک اجباری صورت اختیار کر جائے گی۔ یعنی وہ تقویٰ اور پرہیز گاری میں مجبور ہوگا جو کسی بھی طرح باعثِ افتخار نہیں۔

بنا بریں انسان کو ہر طرح سے آزاد ہونا چاہئیے اور ہر مرحلے پر خدائی آزمائشوں کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اور وہ (چند خاص صورتوں کے علاوہ) فوری طور پر ملنے والی سزاؤں سے محفوظ ہو تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو اچھی طرح اجاگر کرسکے۔

یہاں پر ایک مطلب باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ اگر صورت حال اسی طرح باقی رہے اور جس طرح جس کا جی چاہے کرتا پھرے تو خدا کی عدالت کا قانون (جو تمام کائنات پر حکمران ہے) یہاں پر غیر مؤثر ہوگا۔

لہٰذا یہیں سے ہمیں یقین ہوتا ہے کہ انسان کے لیے ایک عدالت ضرور مقرر کی گئی ہے۔ جہاں پر بلا استثنار ہر ایک کو حاضر ہونا ہے۔ اور اپنے اعمال کا صلہ دریافت کرنا ہے۔

کیا یہ بات ممکن ہے کہ نمرود، فرعون اور چنگیز قسم کے لوگ اپنی ساری زندگی ظلم وستم کرتے رہیں اور ان کے لیے کوئی حساب وکتاب نہ ہو؟

کیا یہ ہوسکتا ہے کہ خدا کے نزدیک گناہگار اور پرہیزگار یکساں ہوں ——— ؟

بلکہ قرآن تو فرماتا ہے کہ:

"اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ كَالۡمُجۡرِمِيۡنَ

مَا لَکُمْ کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ ۔"

" کیا ہم ایسے لوگوں کو مجرمین کی طرح قرار دیں گے جو قانونِ خدا اور حق و عدالت کے آگے جھکے ہوئے ہیں ؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے ؟ تم کس طرح کا فیصلہ کرتے ہو ؟ "

(سورۂ قلم آیات ۳۵-۳۶)

ایک اور جگہ پر خدا فرماتا ہے :

" اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ کَالْفُجَّار "

" کیا یہ بات ممکن ہے کہ ہم پرہیزگاروں کو فاجروں کی مانند قرار دیں ؟

(سورۂ ص آیت ۲۸)

یہ ٹھیک ہے کہ بعض گناہگاروں کو اس دنیا میں اپنے کیے کی کم یا زیادہ سزا مل جاتی ہے ۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ "ضمیر کی عدالت" کا مسئلہ بھی بہت ہی اہم ہے ۔ اس سے بھی انکار نہیں کہ گناہ، ظلم و ستم اور ناانصافیوں کے خطرناک نتائج کبھی انسان کے دامنگیر ہو جاتے ہیں

لیکن اگر ہم خوب غور سے کام لیں تو معلوم ہو گا کہ ان مذکورہ امور میں سے کوئی بھی اس قدر عمومی نہیں ہے کہ ہر ظالم اور گناہگار کو اس کے گناہوں کی پوری پوری سزا ملے ۔

اور بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو مکافات عمل کے آہنی پنجوں، ضمیر کی عدالت کے فیصلوں اور غلط کاموں کے نتائج بھگتنے سے "فرار" کر جانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں یا انھیں مکمل سزا نہیں مل پاتی ۔

لہٰذا ایسے افراد کے لیے بلکہ تمام لوگوں کے لیے ایک ایسی عدالت کا ہونا ضروری ہے جہاں پر ذرہ برابر نیکی یا بدی کو مدنظر رکھ کر سزا یا جزا دی جاسکے وگرنہ صحیح معنوں میں عدالت کا اجراء نہیں ہوسکے گا۔

بنابریں "پروردگار کے وجود" اور "اس کی عدالت" کو قبول کرلینا "قیامت کے وجود" اور "دوسرے جہان" کو قبول کرلینے کے مساوی ہوتا ہے۔ جو ایک دوسرے سے کبھی جدا نہیں ہوسکتے۔

؟ سوالات

۱۔ زمین و آسمان عدل کے ذریعہ کیونکر قائم ہیں؟

۲۔ انسان کو "ارادے کی آزادی اور اختیار" کی نعمت کس لیے دی گئی ہے؟

۳۔ اگر بدکاروں کو اپنے کیے کی فوراً اور سخت سزا مل جائے تو کیا ہو؟

۴۔ مکافات عمل (جیسی کرنی ویسی بھرنی) ضمیر کی عدالت اور اعمال کا ردِ عمل ہمیں قیامت کی عدالت سے کیوں بے نیاز نہیں کرتا؟

۵۔ "خدا کی عدالت" اور "قیامت" کے ساتھ کیا باہمی رابطہ ہے؟

چھٹا سبق

دنیا میں قیامت کا نمونہ

قرآنی آیات سے بخوبی اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ بُت پرست اور دوسرے کفار نہ صرف آنحضرتؐ کے زمانے میں بلکہ آپؐ سے پہلے ادوار میں بھی قیامت کے مسئلے اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے سے تعجب کرتے تھے۔ اور اسے عجیب چیز سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ جو شخص اس مسئلہ کو ان کے سامنے پیش کرتا اسے دیوانہ کہتے تھے اور ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ :

"هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ اِنَّكُمْ لَفِىْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ"

اَفْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَمْ بِہٖ جِنَّۃٌ "

" کیا تمھیں ایسا آدمی نہ بتائیں جو کہتا ہے کہ جب تمھارے بدن بالکل گل سڑ جائیں گے تو تمھیں نئی زندگی ملے گی یا تو یہ شخص خدا پر افترا پردازی کرتا ہے اور یا پھر دیوانہ ہے ۔"

(سورۂ سبا۔ آیت ۷)

اس دور میں نادانی اور کوتاہ فکری کی بنا پر، مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے عقیدے کو جنون یا خدا کی ذات پر افترا پردازی سمجھا جاتا تھا۔ اور ایک بے جان مادے سے زندگی کے وجود میں آنے کو جنون آمیز تصور کیا جاتا تھا

لیکن اس طرح کے افکار کے مقابلے میں قرآن مجید نے ایسے ایسے استدلال پیش کیے ہیں جن کو ایک عام فہم آدمی بھی سمجھ سکتا ہے اور ایک عظیم دانشمند بھی اس سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے ۔

بالفاظ دیگر ہر شخص اپنی عقل و فکر کے مطابق ان دلائل سے استفادہ کر سکتا ہے ۔

اگرچہ اس موضوع پر قرآن مجید میں اس قدر دلائل ہیں جن کی تشریح کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے لیکن یہاں پر ہم ان کی طرف معمولی سا اشارہ کریں گے :

● ـــــ وَاللّٰہُ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ

فَتُثِيرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى
بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ
الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ كَذٰلِكَ
النُّشُوْرُ۔" (سورۂ فاطر آیت ۹)

"خدا تو وہ ہے جس نے ہواؤں کی موجوں کو مامور
کر رکھا ہے کہ بادلوں کو حرکت میں لائیں اور
مردہ زمینوں کی طرف بھگا کرلے جائیں اور ان
کے ذریعے مردہ زمینوں کو دوبارہ زندہ کریں۔
(انسان کے لیے) دوبارہ زندگی بھی اسی طرح ہے"

جب ہم موسمِ سرما میں فطرت کے چہرے کو دیکھتے ہیں تو ہر طرف سے موت کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔

درخت مکمل طور پر پتوں، پھولوں اور میووں سے خالی ہو چکے ہوتے ہیں۔ ٹہنیاں خشک اور بے حرکت نظر آتی ہیں۔ نہ پھول کھلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور نہ ہی کوئی شگوفہ کہیں پر نظر آتا ہے۔ اور کوہ و صحرا میں کہیں پر بھی زندگی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔

جب موسمِ بہار آتا ہے تو ہوا ملائم ہو جاتی ہے۔ بارش کے حیات آفریں قطرے زمین پر گرنا شروع ہو جاتے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے فطرت کے چہرے پر تبسم کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ گھاس اُگنا شروع ہو جاتی ہے۔ درختوں پر پتے ظاہر ہونا شروع کر دیتے ہیں

گل اور شگوفے ایک مرتبہ پھر ظاہر ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔

پرندے درختوں کی ٹہنیوں پر چہچہانے اور گیت گانے شروع کر دیتے ہیں۔

گویا "محشر" کا شور برپا ہو جاتا ہے۔

اگر مرنے کے بعد زندگی کا کوئی مفہوم نہ ہوتا تو ہم ہر سال ان مناظر کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتے۔

اگر مرنے کے بعد دوبارہ زندگی ایک محال چیز اور جنون آمیز بات ہوتی تو ہر سال ہم ایسی چیزوں کو مجسم ہوتا نہ دیکھتے۔

مرنے کے بعد زمین کے دوبارہ زندہ ہونے اور موت کے بعد انسان کے دوبارہ زندگی حاصل کرنے کے درمیان کیا فرق ہے ——— ؟

● ——— کبھی قرآن مجید مشرکین اور بُت پرستوں کا ہاتھ پکڑ کر انھیں ابتدائے آفرینش کی طرف لے جاتا ہے، انسان کو ابتدائی خلقت یاد دلاتا ہے اور اس صحرائی بدّو کے ماجرے کی یادآوری کرتا ہے جو ایک ہڈی ہاتھ میں لے کر آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچا اور کہا :

"اے محمّد (ص) مجھے بتاؤ اس ہڈی کے دوبارہ زندہ کرنے پر کس کو قدرت ہے ؟ کون ایسا کام کر سکتا ہے ؟ "

اس کے گمان میں تھا کہ وہ قیامت کی نفی پر ایک دندان شکن دلیل لے آیا ہے۔ لیکن قرآن کے ذریعے خداوندِ عالم نے پیغمبرؐ کو فوراً حکم دیا کہ اسے کہہ دیجیے :

" یُحْیِیْهَا الَّذِیْ اَنْشَاَهَا اَوَّلَ مَرَّةٍ "

(سورہ یٰس آیت ۷۹)

"جس نے اسے پہلے، ایک بے جان مادے اور اسی
آب وخاک سے پیدا کیا ہے وہی ذات اسے
دوبارہ زندہ کرے گی۔"

ابتدائی پیدائش اور دوبارہ زندہ کرنے میں کیا فرق ہے؟
یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر ایک مختصر
لیکن نہایت ہی با معنیٰ جملے پر اکتفا کی گئی ہے۔
خدا فرماتا ہے:

"كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ"

"جس طرح ہم نے ابتدا میں پیدا کیا ہے اسی طرح
دوبارہ پلٹائیں گے۔"

(سورۂ انبیاء آیت ۱۰۴)

● —— کبھی قرآن مجید خدا کی عظیم قدرت کو زمین و آسمان کی
خلقت کے ذریعے یاد دلاتا ہے۔ اور فرماتا ہے:

"جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو خلق کیا ہے
کیا وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ وہ اسی طرح
پیدا کرے؟ وہ ضرور اس بات پر قادر ہے،
وہی پیدا کرنے والا اور آگاہ ہے۔ جب بھی وہ
کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہہ دیتا ہے "ہوجا"
تو وہ ہو جاتی ہے۔"

(سورہ یٰس آیات ۸۱-۸۲)

جو لوگ ان مسائل میں شک کرتے تھے دراصل وہ، وہ لوگ تھے جن کی

فکر اور سوچ کی فضا ان کے اپنے گھروں تک ہی محدود تھی ورنہ وہ اس حقیقت کا ضرور درک کر لیتے کہ خدا کے لیے دوبارہ زندہ کرنا ابتدائے آفرینش سے زیادہ آسان ہے اور مُردوں کو دوبارہ زندگی دینا اس خدا کے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اس عظمت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

بہر حال آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن مجید نے کیسے منطقی دلائل کے ساتھ ان لوگوں کو دندان شکن جواب دیے ہیں جو معاد کے مسئلے میں شک کرتے تھے بلکہ معاد کا مسئلہ پیش کرنے والے کو دیوانہ کہتے تھے۔

ان دلائل کے ذریعے امکان معاد کا مسئلہ بخوبی روشن ہو جاتا ہے جس کی طرف ہم نے صرف ایک مختصر سا اشارہ کیا ہے۔

؟ سوالات

۱۔ مشرکین "معاد" کے مسئلے کو عجیب کیوں سمجھتے تھے؟

۲۔ عالمِ فطرت میں ہر سال معاد کا منظر کس طرح نظر آتا ہے؟

۳۔ قرآن نے بہت سی آیات میں "بچے کے شکم مادر میں رہنے کے دوران" کو "معاد" سے کس لیے تشبیہ دی ہے؟

ساتواں سبق

معاد اور پیدائش کا فلسفہ

بہت سے لوگ پوچھتے ہیں کہ

"خدا نے ہمیں کیوں پیدا کیا ہے ــــــ؟

اور کبھی تو وہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

"بلکہ اس عظیم جہان کی پیدائش ہی کا فلسفہ کیا ہے ــــــ؟"

"باغ کا مالی میوہ حاصل کرنے کے لیے باغ لگاتا ہے، زمیندار، محصول اٹھانے کے لیے زمین میں بیج ڈالتا ہے، لیکن کائنات کے خالق نے ہمیں کس لیے پیدا کیا ہے ــــــ؟

"آیا خدا کے پاس کسی قسم کی کمی تھی کہ اس سے وہ

اس کمی کو پورا کر رہا ہے ؟ اگر اس غرض سے
پیدا کیا ہے تو وہ اس بات کا محتاج کہلائے گا جو
پروردگار کی شان کے منافی ہے ۔"

یہ اور اس قسم کے دوسرے سوالات ـــــــــــــ !!!

ایسے سوالات کے لیے ہمارے پاس بہت سے جواب ہیں لیکن اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے چند ایک جملوں میں اس کا خلاصہ پیش کریں گے ۔

ہماری بہت بڑی غلطی اس میں ہے کہ ہم خدائی صفات کو اپنی صفات جیسا سمجھتے ہیں چونکہ ہم ایک محدود مخلوق ہیں لہٰذا جو کام بھی کرتے ہیں اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کرتے ہیں ۔

اگر سبق پڑھتے ہیں تو علم کی کمی کو پورا کرنے کے لیے ، کام کرتے ہیں تو مالی کمی کو پورا کرنے کے لیے اور اگر علاج معالجہ کرتے ہیں تو صحت و سلامتی کو برقرار رکھنے کے لیے ۔

لیکن خداوند متعال کے بارے میں یہ چیز صادق نہیں آتی ۔ کیونکہ وہ ایسی ذات ہے جس کی کوئی حد اور انتہا نہیں اگر وہ کوئی کام کرتا ہے تو اس سے اس کی غرض اس کی اپنی ذات نہیں ہوتی ۔ بلکہ دوسروں پر اس کا لطف و عنایت مقصود ہوتا ہے وہ کسی کو پیدا کرتا ہے تو اس لیے نہیں کہ اسے کوئی ذاتی مفاد پہنچے ، بلکہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے بندوں پر لطف و عنایت فرمائے ۔

وہ مجسّم نور ہے ، بغیر کسی قسم کی نیاز کے نور افشانی کرتا ہے تاکہ اس کی روشنی سے ہر ایک بہرہ مند ہو ۔ یہ اس فیّاض اور لا متناہی ذات کا منشاء ہے کہ وہ اپنی مخلوقات کی دستگیری کر کے درجۂ کمال تک پہنچائے ۔

ہمارا عدم سے وجود میں آنا بھی کمال کا ایک مرحلہ ہے ۔ اسی طرح

انبیار کا بھیجنا، آسمانی کتابوں کا نازل کرنا، قوانین کا مقرر کرنا بھی ہمارے تدریجی کمال کے مختلف مراحل ہیں۔

"یہ دنیا ایک عظیم یونیورسٹی ہے اور ہم اس کے طالب علم" [۱]

"یہ دنیا ایک کھیتی ہے اور ہم اس کے کسان" [۲]

"یہ دنیا ایک سود مند تجارتی منڈی ہے اور ہم اس کے تاجر!" [۳]

ہم تخلیق بشر کے لیے فلسفے کے کیوں کر قائل نہ ہوں جبکہ کائنات کے ہر ذرے کی تخلیق کا مقصد اور فلسفہ موجود ہے۔

ہمارے بدن کے عجیب وغریب کارخانہ میں کوئی بھی ایسا عضو نہیں جس کا کوئی مقصد نہ ہو حتیٰ کہ آنکھوں کی پلکیں اور پاؤں کے تلوے کی گہرائی۔

تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمارے بدن کے ہر ہر ذرے کا تو کوئی مقصد اور فلسفہ ہو لیکن ہمارے پورے جسم کا کوئی مقصد ہی نہ ہو۔ ؟

ذرا اپنے وجود سے باہر نکل کر سوچیں اور اس عظیم کائنات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اس کی ہر ہر چیز کے لیے کوئی نہ کوئی حکمت اور فلسفہ موجود ہے سورج کی روشنی کا فلسفہ، بارش کا مقصد اور ہوا کی مخصوص ترکیبات کا مقصد، غرض کوئی چیز مقصد کے بغیر نہیں ہے۔

ہر ایک چیز کا جداگانہ مقصد تو موجود ہو لیکن مجموعی طور پر یہ کائنات بے مقصد ہو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اس وسیع کائنات کے سینے پر گویا ایک بورڈ لگا ہوا ہے جس کو ہم بسا اوقات کائنات کی عظمت کی وجہ سے ابتدائی لمحات میں نہیں دیکھ پاتے

---

[۱]، [۲]، [۳] کلمات قصار، نہج البلاغہ اور امیر المومنین کی معروف حدیث الدنیا مزرعۃ الآخرۃ سے ماخوذ

جس پر یہ عبارت درج ہے :

"تربیت اور کمال"

اب جبکہ ہم اپنی تخلیق کے مقصد سے اجمالی طور پر آگاہ ہو چکے ہیں تو دیکھنا یہ ہے کہ یہ چند روزہ دنیاوی زندگی جس میں مشکلات بھی ہیں اور مصائب بھی، دکھ درد بھی ہیں اور ناکامیاں بھی، ہماری پیدائش کا مقصد بن سکتی ہے؟

فرض کیجیے کہ ایک شخص اس دنیا میں ساٹھ سال تک زندہ رہتا ہے۔ ساری عمر صبح سے شام تک روزی کی تلاش میں لگا رہتا ہے اور رات کو تھکا ماندہ گھر واپس لوٹتا ہے اور کھا پی کر سو جاتا ہے۔

تو کیا اس کی ساری زندگی کا مقصد صرف یہی ہے کہ دنیا میں رہ کر کئی ٹن کھانا کھائے اور کئی ہزار لیٹر پانی پیے اور ہزار مشکل سے ایک گھر بھی بنائے اور پھر ایک مرتبہ سب کچھ چھوڑ کر اس دنیا سے کوچ کر جائے۔

تو کیا یہ ہدف اور مقصد اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ انسان اس دنیا کے اس قدر رنج و غم اور دکھ درد مول لے لے؟

کوئی انجینئر ایک عظیم الشّان عمارت بیابان میں تعمیر کرے، اس پر بہت بڑی رقم بھی خرچ کرے اور کئی سال اس کے بنانے پر لگا دے، اس کے اندر ضروریات زندگی کی ہر چیز بھی مہیّا کر دے۔ صرف اس لیے کہ اس راہ سے گزرنے والا مسافر ایک آدھ گھنٹے کے لیے یہاں پر سستا لے۔

آیا آپ اس کی اس فکر پر تعجب نہیں کریں گے؟ اور نہیں کہیں گے کہ کسی رہگزر کے ایک آدھ گھنٹے کے سستانے کے لیے اتنی بڑی عمارت اور اس قدر اہتمام کی کیا ضرورت ہے؟

اسی دلیل کی بنا پر جو لوگ قیامت اور مرنے کے بعد دوسری زندگی پر

ایمان نہیں رکھتے۔ وہ اس دنیا کو کھوکھلا اور بے مقصد سمجھتے ہیں۔ اور مادہ پرست لوگ عموماً اس عقیدے کا اظہار کرتے رہتے ہیں کہ اس دنیا کا نہ تو کوئی مقصد ہے اور نہ ہی ہدف، بلکہ بے فائدہ، بے سود اور بے مقصد ہے۔ اسی لیے ان میں سے بہت سے لوگ خودکشی پر اتر آتے ہیں۔ کیونکہ وہ بقول اپنے اس فضول، بے فائدہ اور بے مقصد زندگی سے اکتا چکے ہوتے ہیں۔

لیکن جو بات زندگی کو مقصد عطا کرتی ہے اور اسے معقول اور بامعنی بناتی ہے وہ یہ ہے کہ "یہ زندگی، مقدمہ ہے ایک دوسرے جہان کے لیے" اور یہاں پر اٹھائی جانے والی مشکلات ایک نئی زندگی کا پیش خیمہ ہیں۔

اس مقام پر پھر وہی جنین والی مثال پیش کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ جو بچہ ابھی تک شکمِ مادر میں ہے اگر اس کے پاس کافی عقل و ہوش ہوتا اور اس سے کہا جاتا کہ :

زندگی بس یہی ہے جو تو نے ماں کے پیٹ میں رہ کر گزارنی ہے یعنی یہی نو دس مہینے اس کے بعد کچھ نہیں ہے تو یقیناً وہ اپنی اس زندگی پر احتجاج کرتا اور کہتا کہ :

" اس ماحول میں نو دس مہینے تک مقید بھی رہوں،
ساری زندگی خون پیتا رہوں اور ہاتھ پاؤں بندھے
ایک کونے میں پڑا رہوں، آخر میں نتیجہ کچھ بھی
نہ نکلے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ خالق کائنات کا
ایسی تخلیق سے کیا مقصد ہو سکتا ہے ؟ "

لیکن اگر اسے یہ یقین دلایا جائے کہ چند ماہ کا یہ مقدماتی مرحلہ دنیا میں ایک طولانی زندگی بسر کرنے کے لیے ہے۔ تاکہ تم اس میں خود کو وہاں کے لیے اچھی طرح تیار کر لو۔ وہ ایسا جہان ہے جو تمھاری موجودہ دنیا کی نسبت زیادہ

وسیع، روشن اور پرشکوہ ہے، وہاں پر مختلف قسم کی نعمتیں موجود ہیں تو ایسی صورت میں وہ یقیناً مطمئن ہو جائے گا کہ نو دس ماہ کا یہ مختصر دورہ ضرور ایک مقصد رکھتا ہے لہٰذا یہاں پر ملنے والی تکلیفیں قابل برداشت ہیں۔

قرآن مجید فرماتا ہے

"وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُولٰی فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ"

"تم نے اس جہان کی زندگی کو جان لیا ہے تو اس کی یاد آوری کیوں نہیں کرتے؟ کہ اس کے بعد ایک اور جہان بھی ہے۔"

(سورہ واقعہ۔ آیت ۶۲)

خلاصہ یہ کہ: یہ دنیا چیخ پکار کر کہہ رہی ہے:

"لوگو! اس جہان کے بعد ایک دوسرا جہان بھی ہے وگرنہ کائنات کا وجود ایک تماشہ بن کر رہ جائے گا۔"

اسی چیز کو قرآن کی زبانی سنیئے۔ فرماتا ہے:

"اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ"

"کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں بے کار خلق فرمایا ہے اور تم نے دوبارہ ہماری طرف لوٹ کر نہیں آنا؟" (سورۂ مومنون۔ آیت ۱۱۵)

یہ آیۃ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر "معاد" (جسے قرآن میں "خدا کی طرف لوٹ جانے" سے یاد کیا گیا ہے) کا وجود نہ ہوتا تو انسان کی تخلیق یقیناً بے کار بے فائدہ اور عبث ہوتی۔

ان تمام گزارشات کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس دنیا کے بعد ایک اور جہان کا ہونا ضروری ہے کیونکہ فلسفۂ تخلیق اسی بات کا خواہاں ہے۔

سوالات ؟

① خدا کی صفات سے مخلوق کی صفات کا مقابلہ کیوں نہیں کیا جا سکتا ؟

② ہماری تخلیق کا کیا مقصد ہونا چاہیے ؟

③ آیا دنیاوی زندگی تخلیق کائنات کا سبب بن سکتی ہے ؟

④ جب اس زندگی کا جنین کی زندگی سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو ہمیں کیا درس ملتا ہے ؟

⑤ قرآن مجید نے اس کائنات کی پیدائش کے ذریعے آخرت کے وجود پر کیا استدلال کیا ہے ؟

آٹھواں سبق

رُوح کی بقاء اور قیامت

انسان نے کب سے "روح" کے متعلق سوچنا شروع کیا ہے؟ اس کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ انسان نے شروع شروع میں اپنے اور اس دنیا کی دوسری مخلوقات کے درمیان فرق معلوم کیا۔ یعنی اس نے یہ محسوس کیا کہ اس کے اور پتھر، لکڑی، پہاڑ اور صحرا کے درمیان بہت فرق ہے۔ اسی طرح انسان دوسرے حیوانات سے بھی بہت فرق رکھتا ہے۔

انسان نے نیند اور موت کی صورت حال کو دیکھا، بیدار یا زندہ انسان اور سوئے ہوئے یا مردہ انسان میں زبردست فرق پایا۔ لہٰذا یہاں سے اس نے معلوم کیا کہ اس مادی جسم کے علاوہ ایک اور جوہر بھی اس کے پاس موجود ہے۔

خاص کر نیند کی حالت میں جبکہ تمام بدن آرام کے ساتھ ایک جگہ پڑا ہوتا ہے لیکن عالم خواب میں اسے مختلف مناظر دیکھنے میں آتے ہیں تو یہاں سے اس نے سمجھ لیا کہ ایک پراسرار طاقت اس پر حکم فرما ہے جسے اس نے "روح" کا نام دیا۔

جب انسان نے فلسفے کی بنیاد رکھی تو فلسفہ کے دوسرے موضوعات کے ساتھ ساتھ "روح" کو بھی ایک اہم موضوع کی صورت میں جگہ دی۔ اس کے بعد جو فلسفی بھی آتا اس پر ضرور اظہار خیال کرتا۔

یہاں تک کہ بعض مسلم اسکالرز کے قول کے مطابق "روح" کے بارے میں تقریباً ایک ہزار نظریے ملتے ہیں۔ جن میں روح کی حقیقت اور اس سے متعلق امور پر بحث کی گئی ہے۔

یہاں پر کہنے کے لیے تو بہت سی باتیں ہیں لیکن جو بات بحث کے لیے سب سے زیادہ موزوں نظر آتی ہے وہ یہ کہ:

آیا روح مادّی چیز ہے یا غیر مادّی؟

بالفاظِ دیگر آیا وہ ایک مستقل چیز ہے یا مغز اور دوسرے اعصاب کے فزیکل اور کیمیکل خواص میں سے ہے؟

بعض مادہ پرست فلاسفہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ رُوح اور اس کے متعلقات مادّی ہیں اور مغز کے کیمیکل اور فزیکل خواص میں سے ہیں۔ چنانچہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے ساتھ رُوح کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جس طرح گھڑی کو توڑ دیا جائے تو اس کا کام کرنا بھی بند ہو جاتا ہے۔

ان (مادہ پرست) فلاسفہ کے مقابلے میں خدا پرست فلاسفہ ہیں جو اس بات کے معتقد ہیں کہ

انسان کے مرنے کے بعد روح کو موت نہیں آتی۔ بلکہ وہ زندہ

رہتی ہے۔ بالفاظ دیگر وہ ایک مستقل چیز ہے۔ اور وہ اس استقلال کے لیے بہت سے پیچیدہ دلائل پیش کرتے ہیں جن میں سے چند ایک دلائل کو ہم سادہ اور عام فہم الفاظ میں بیان کریں گے۔

ا۔ ایک عظیم جہان ایک چھوٹی سی جگہ نہیں سما سکتا ——— !

فرض کیجیے کہ آپ بحر اوقیانوس کے ساحل پر بیٹھے ہوئے ہیں اور اس کے اطراف میں بہت بڑے پہاڑ ہیں جن کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ سمندر سے کوہ پیکر موجیں اُٹھ اٹھ کر پہاڑ کی چٹانوں سے ٹکراتی اور پھر واپس چلی جاتی ہیں۔ ادھر رات کے وقت نیلگوں آسمان سمندر کو گھیرے ہوئے ایک عجیب منظر پیش کر رہا ہوتا ہے۔

ایک لمحے کے لیے ہم آنکھیں بند کر کے اس منظر کو اپنی آنکھوں میں مجسّم کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے وہی سب کچھ جو ہم نے آنکھیں کھول کر دیکھا تھا اس کا ہو بہو نقشہ ہمارے ذہن میں آجاتا ہے۔

یقیناً اسی ذہنی نقشے اور خیالات میں آنے والے اس عظیم منظر کو مغز کے چھوٹے چھوٹے خلیوں میں جگہ دینا ہرگز ناممکن ہے کیونکہ ایک عظیم منظر کو ایک چھوٹے سے نقطے کے ساتھ کسی بھی صورت میں تطبیق نہیں دی جا سکتی۔ جبکہ ہم اس منظر کو بطور کامل اپنے ذہن میں محسوس بھی کرتے ہیں۔

یہ امر اس بات کی دلیل ہے کہ جسم اور مغز کے خلیوں کے علاوہ ہمارے اندر ایک اور جوہر موجود ہے جو بڑے سے بڑے مناظر کو اپنے اندر منعکس کر سکتا ہے اور یہ ایسا جوہر ہے جو مادّی دنیا سے بالاتر ہے۔ کیونکہ مادّی دنیا میں ایسی کوئی چیز ہمیں نہیں

ملتی جس ہیں اس طرح کی خاصیت موجود ہو۔

۲۔رُوح کی بیرونی خاصیت

ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارا ظاہری دنیا کے ساتھ بیرونی رابطہ موجود ہے اور بیرونی دنیا کے ساتھ ہمارا تعلق ہے اور ہم اس کے تمام مسائل اور حالات سے پوری طرح آگاہ ہیں۔

تو کیا باہر کی دنیا ہمارے اندر آجاتی ہے ؟

جواب یقیناً نفی میں ہو گا۔

جب ایسا نہیں ہے تو پھر صحیح صورت حال کیا ہے ؟

یقیناً اس بیرونی دنیا کا نقشہ روح ہی کے ذریعے ہمارے ذہن میں پہنچتا ہے جس سے ہم باہر کی دنیا کے ساتھ اپنا رابطہ قائم کرتے ہیں اور یہ خاصیت ہمارے بدن کے کسی فزیکل یا کیمیکل عضو یا خلیے کے ذریعے ممکن نہیں ہے۔

بالفاظ دیگر بیرونی مخلوقات سے آگاہ ہونے کے لیے ان پر ایک طرح کا احاطہ کرنا ضروری ہے جو مغز کے خلیوں کا کام نہیں ہے۔ یہ خلیے بدن کے دوسرے خلیوں کی طرح باہر کی دنیا سے متاثر تو ہو سکتے ہیں لیکن اس پر احاطہ نہیں کر سکتے۔

اس فرق سے معلوم ہوتا ہے کہ بدن کی فزیکل تبدیلیوں کے علاوہ ایک اور حقیقت ہمارے اندر پائی جاتی ہے جو ہمیں اپنے وجود کے بیرونی دنیا پر احاطہ کرنے کی قوت عطا کرتی ہے، جو روح کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

اور وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اس مادی دنیا اور اس کی خصوصیات سے بالاتر ہے۔

۳۔ تجربات سے روح کے مستقل ہونے کا ثبوت

آج کے دور میں دانشمندوں نے مختلف سائنسی تجربوں سے ثابت کر دیا ہے کہ روح ایک مستقل چیز ہے اور یہ ان لوگوں کے لیے ایک دندان شکن جواب ہے جو روح کے مستقل ہونے کے منکر اور یا اسے ایک مادی عنصر سمجھتے ہیں۔ مقناطیسی نیند یا ہپناٹزم Hypnotism اور میگنیٹزم Magnetism اس بات کا واضح ثبوت ہیں جو مختلف تجربات کے بعد پایۂ ثبوت تک پہنچ چکے ہیں اسے بہت سے لوگوں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ البتہ جن لوگوں نے نہیں دیکھا ان کے لیے مختصر سی تشریح کرتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ:

علم الارواح کے ماہرین کے ذریعے مختلف علمی طریقوں سے کسی شخص کو سلا دیا جاتا ہے۔ سلانے والے کو "عامل" اور سونے والے کو "معمول" کہتے ہیں۔ عامل اپنے معمول کو کچھ پڑھاتا ہے اور اس کی فکر کو ایک جگہ متمرکز کرتا ہے اور مقناطیسی قوت کے ذریعے اس کی آنکھوں اور کانوں وغیرہ کو گہری نیند میں سلا دیتا ہے۔ یہ نیند عام معمول کی نیند سے مختلف ہوتی ہے جس سے عامل اپنے معمول سے رابطہ قائم رکھ سکتا ہے اور عامل اپنے معمول سے مختلف

قسم کے سوالات کرتا ہے جس کے وہ صحیح صحیح جوابات دیتا ہے۔
ایسی حالت میں وہ اس کی روح کو دنیا کے مختلف حصوں میں بھیجتا ہے تاکہ کوئی نئی خبر لے آئے۔ چنانچہ اس طرح سے وہ کبھی کبھی نئی خبریں لے آتی ہے اور ایسے مسائل سے آگاہ کرتی ہے جو عمومی طور پر اسے معلوم نہیں ہوتے اور کبھی تو وہ (معمول) اپنی مادری زبان کے علاوہ ایسی زبانوں میں گفتگو کرتا ہے جن سے وہ ہرگز آشنا نہیں ہوتا۔ کبھی ریاضی کے پیچیدہ مسائل کو حل کرتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کچھ مطالب کو لکھ کر ایک صندوق میں رکھ دیا جاتا ہے اور اسے مقفل کر دیا جاتا ہے اور معمول سے کہا جاتا ہے کہ صندوق میں موجود مطالب کو لکھ کر بیان کرے۔ تو وہ بعینہٖ انہی مطالب کو لکھ دیتا ہے۔

اسپرائیٹلزم Spiritualism یا مرنے کے بعد ارواح کے ساتھ رابطہ پیدا کرنا، روح کے مستقل ہونے کی ایک اور دلیل ہے۔

اس وقت بھی علم الارواح کے ماہرین کافی تعداد میں دنیا میں موجود ہیں جو مشہور مصری دانشور "فرید وجدی" کی تحقیقات کے مطابق دنیا بھر میں تین سو کے لگ بھگ اخبارات اور رسالے شائع کرتے ہیں۔ ان کے باقاعدہ اجلاس ہوتے ہیں جن میں دنیا کی مشہور شخصیات شریک ہوتی ہیں۔ جن کی موجودگی میں ارواح کو بلایا جاتا ہے اور ان سے عجیب وغریب کام لیے

جاتے ہیں۔

اگرچہ اس بات سے بہت سے ٹھگ باز لوگ ناجائز فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں جنھیں اس بارے میں ذرا بھر بھی معلومات نہیں ہوتیں اور وہ اس طرح سے لوگوں کی جیبوں پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے اس کردار سے حقیقت کو نہیں چھپایا جا سکتا جس کی بہت سے بڑے محقق بھی اعتراف کرتے ہیں۔[1]

یہ سب باتیں روح کے مستقل ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور اس بات کی شاہد ہیں کہ انسان کے جسم کے مر جانے سے اس کی روح کو موت نہیں آتی۔

ہم جو خواب دیکھتے ہیں اور عالم خواب میں کچھ مناظر ہمارے سامنے مجسم ہو کر آجاتے ہیں۔ کبھی آنے والے واقعات سے پردہ اٹھاتے ہیں اور مخفی مسائل سے آگاہ کرتے ہیں انھیں اتفاقی مسائل نہیں کہا جا سکتا بلکہ روح کے مستقل ہونے پر روشن دلیل ہیں۔ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جنھوں نے اپنے کسی دوست یا عزیز سے کوئی خواب سنا ہے اور ایک عرصے کے بعد جب اس کی تعبیر ظاہر ہوئی ہے تو کسی قسم کی کمی بیشی کے بغیر وہی کچھ تھا جو خواب میں دیکھا گیا تھا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کی روح عالم خواب میں دوسرے

---

[1] مزید تفصیل کے لیے فارسی کتب "عود ارواح" اور "جہان پس از مرگ" کا مطالعہ کیا جائے۔

عالموں سے تعلقات پیدا کر لیتی ہے۔ بسا اوقات آئندہ آنے والے واقعات کو مشاہدہ کرتی ہے۔

ان تمام امور سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ "روح" نہ تو مادی چیز ہے اور نہ ہی انسانی مغز کی فزیکل اور کیمیکل خصوصیات کی حامل ہے۔

بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اس مادی دنیا سے بالاتر ہے۔ اور جسم کے مرنے سے اسے موت نہیں آتی۔

اور یہ چیز بذاتِ خود معاد اور مرنے کے بعد دوسری زندگی کے لیے راہ ہموار کرتی ہے!

سوالات

1. "روح کے مسئلہ" کے بارے میں خدا پرست اور مادہ پرست فلسفیوں کے درمیان کیا فرق ہے؟
2. "روح کے بارے میں بڑی چیز چھوٹی چیز کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی" اس سے کیا مراد ہے؟
3. مقناطیسی نیند یا ہپناٹزم اور میگنیٹزم کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
4. ارواح کے ساتھ رابطے سے کیا مراد ہے؟
5. سچے خواب روح کے مستقل ہونے پر کس طرح دلالت کرتے ہیں؟

نواں سبق

جسمانی اور روحانی معاد

معاد یا قیامت کی بحث میں ایک اہم ترین سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا معاد کا فقط ایک "روحانی" پہلو ہے یا انسان کا جسم اور بدن بھی قیامت کے دن دوبارہ اٹھایا جائے گا؟

اور آیا انسان اسی جسم اور روح کے ساتھ اپنی نئی زندگی کا آغاز کرے گا ______؟

بہت سے قدیم فلاسفہ اس بات کے معتقد تھے کہ فقط روح کو دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ کیونکہ یہ جسم تو دنیا میں روح کی ایک سواری ہے۔ مرنے کے بعد روح جس سے بے نیاز ہو جاتی ہے اور اسے چھوڑ کر عالم ارواح میں پہنچ جاتی ہے۔

لیکن اسلام کے بزرگ علماء اور کئی دوسرے فلاسفہ کا یہ عقیدہ ہے کہ معاد کا تعلق دونوں چیزوں سے ہے۔ جسم سے بھی اور روح سے بھی۔ ان کا

کہنا ہے کہ :

"یہ ٹھیک ہے کہ مرنے کے بعد یہ جسم خاک میں مل
جائے گا اور خاک زمین میں منتشر ہو جائے گی
لیکن خداوند متعال اس بات پر قادر ہے کہ ان
بکھرے ہوئے ذرات کو بروز قیامت اکٹھا کرے
اور اسے نئی زندگی بخشے ۔"

اس موضوع کو وہ "معاد جسمانی" سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ "معادِ روحانی" پر تو سب کا اتفاق ہے ۔ اختلاف ہے تو صرف اس بات پر کہ جسم کو دوبارہ اٹھایا جائے گا یا نہیں ؟ لہٰذا ہم نے "معاد جسمانی" کا نام اسی لیے منتخب کیا ہے ۔

قرآن مجید میں حد سے زیادہ آیات معاد کے بارے میں موجود ہیں اور ان کا "معاد جسمانی" کے ساتھ تعلق ہے ۔

جسمانی معاد اور قرآن

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ کس طرح ایک صحرائی بدو ایک پرانی اور بوسیدہ ہڈی لے کر پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا :

"اس ہڈی کو کون دوبارہ زندہ کرے گا ؟"

تو آنحضرتؐ نے بحکم پروردگار اسے جواب دیا کہ

"وہی ذات جس نے اسے پہلے پیدا کیا ہے ۔ وہی ذات
جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور سبز درخت
سے آگ کو ظاہر کیا ہے ... "

یہ سب آیات سورۂ یٰسں کے آخر میں موجود ہیں ۔

خداوندِ عالم ایک اور جگہ فرماتا ہے :

" تم قیامت کے روز قبروں سے خارج کیے جاؤ گے "۔

(سورۂ قمر - آیت ۷)

اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ قبر جسم کا مقام ہوتی ہے نہ کہ روح کا۔

درحقیقت قیامت کا انکار کرنے والوں کا تعجب تو اس بات پر تھا کہ :

" وَقَالُوٓا ءَإِذَا ضَلَلۡنَا فِي ٱلۡأَرۡضِ ءَإِنَّا لَفِي خَلۡقٍ جَدِيدٍ "

" جب ہم خاک میں مل کر مٹی ہو جائیں گے اور وہ مٹی ادھر ادھر منتشر ہو جائے گی تو پھر بھی ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے ؟ " (سورہ سجدہ - آیت ۱۰)

تو قرآن مجید ان کے جواب میں فرماتا ہے کہ :

" جس خدائے قادر نے پہلے تمھیں پیدا کیا ہے وہی اس بات پر قادر ہے کہ تمھیں دوبارہ زندہ کرے اور یہ بات خدا کے لیے بہت آسان ہے ۔ "

(سورہ عنکبوت - آیت ۱۹)

ایک اور عرب بدو کہتا ہے کہ

" یہ شخص (پیغمبر اکرمؐ) تمھیں کس قسم کے وعدے دیتا ہے ؟ اور کہتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور زمین میں مل جاؤ گے تو تمھیں دوبارہ زندگی ملے گی "

(سورۂ مومنون - آیت ۳۵)

یہ اور دوسری قرآنی آیات صاف بتا رہی ہیں کہ پیغمبر اسلام نے ہر جگہ "معادِ جسمانی" کا مسئلہ پیش کیا ہے۔ مشرک اور کوتاہ نظر لوگوں کا اعتراض بھی اسی بارے میں تھا اور جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ:

قرآن مجید نے بھی جسمانی معاد کے ثبوت کے لیے دنیا میں نباتات وغیرہ میں معاد کے نمونے کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ خداوند عالم ایسا کرنے پر قادر ہے۔

بنابریں یہ بات بالکل ناممکن ہے کہ کوئی شخص مسلمان تو ہو اور قرآن مجید سے بھی تھوڑی بہت آگاہی رکھتا ہو لیکن "جسمانی معاد" کا انکار کرے۔ قرآنی نکتہ نظر سے جسمانی معاد کا انکار گویا خود قیامت کا انکار ہوتا ہے۔

عقلی دلائل

مذکورہ دلائل سے ہٹ کر خود انسان کی اپنی عقل بھی کہتی ہے کہ "جسمانی معاد" ہی ہوگا۔ کیوں کہ روح اور بدن دو مختلف حقیقتیں تو ہیں لیکن ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔

دونوں مستقل ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مربوط ہیں، باہم پرورش پاتے، پروان چڑھتے اور کمال کے مراحل طے کرتے ہیں۔

جب دنیا میں وہ آپس میں ایک دوسرے سے متعلق ہیں تو آخرت کی زندگی گزارنے کے لیے بھی انھیں ساتھ ساتھ رہنا چاہیے۔

اگر برزخ (دنیا اور آخرت کے درمیانی فاصلے) کے دوران میں وہ ایک دوسرے سے کچھ مدت کے لیے جدا ہو جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا رہیں گے۔ کیونکہ جسم روح کے بغیر اور روح

جسم کے بغیر نامکمل اور ناقص ہیں۔

روح، جسم کا حاکم اور محرک ہے،

اور جسم، روح کا فرمان بردار اور آلۂ کار۔

کوئی حاکم اپنی رعایا سے اور کوئی ہنر منداپنے ہتھیار سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔

البتہ چونکہ روح قیامت کے دن اس دنیاوی اور مادی چیزوں سے بلند مرتبے پر ہوگی اسی نسبت سے انسان کا جسم بھی بروز قیامت ان دنیاوی نقائص سے پاک وصاف ہوجائے گا جس میں نہ تو بوسیدگی ہوگی اور نہ ہی کسی قسم کا نقص اور کوئی دوسری کمی باقی رہے گی۔

بہر حال جسم اور روح ایک دوسرے کے ہمزاد اور تتمہ ہیں۔ قیامت کے دن صرف جسم یا صرف روح کو دوبارہ نہیں اٹھایا جائے گا۔ بلکہ دونوں کو ساتھ ساتھ محشور کیا جائے گا۔

بالفاظِ دیگر، جسم اور روح کی پیدائش، ان کا آپس کا ربط اور باہمی تعلق اس بات کی روشن دلیل ہے کہ دونوں کو اکٹھے محشور کیا جائے۔

اور پھر عدالت کا قانون بھی تو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ معاد دونوں چیزوں کے لیے ہونی چاہیے۔ کیونکہ اگر انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو روح اور جسم دونوں کے ساتھ کرتا ہے لہٰذا سزا یا جزا بھی تو دونوں کو یکساں طور پر ملنی چاہیے۔

اگر صرف روح کے لیے معاد ہو اور جسم کے لیے نہ ہو یا جسم کے لیے ہو لیکن روح کے لیے نہ ہو تو عدالت صحیح معنوں میں نافذ نہیں ہوگی۔

؟ سوالات

① آیا آخرت کی زندگی ہر لحاظ سے اسی دنیاوی زندگی کے مشابہ ہے ؟

② آیا قیامت کے دن ملنے والی سزاؤں کو ہم اس دنیا میں محسوس کر سکتے ہیں ؟

③ آیا بہشت کی نعمتیں اور جہنم کا عذاب فقط جسم کے لیے ہیں ؟

دسواں سبق

بہشت، دوزخ اور اعمال کا مجسّم ہونا

بہشت و دوزخ

بہت سے لوگ اپنے آپ سے پوچھتے ہیں کہ مرنے کے بعد والا جہان بھی اسی دنیا کی مانند ہوگا یا ان کے درمیان کسی قسم کا کوئی فرق ہے؟

وہاں کی سزا و جزا، نعمتیں اور تکلیفیں، غرضیکہ وہاں کے نظام و قوانین بھی اسی دنیا کی مانند ہوں گے؟

ان کے جواب کے لیے عرض ہے کہ

اس بات کے بہت سے شواہد موجود ہیں کہ اس جہان کا اس دنیا سے اس قدر فرق ہے جس قدر زمین و آسمان کا فرق، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

جہاں تک قیامت اور اس کے بعد کے حالات کے متعلق جاننے کا

تعلق ہے تو وہ ایسا ہے جیسے بہت ہی دُور سے کسی چیز کا پرتو دکھا دے۔

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر ایک مرتبہ پھر وہی جنین (شکم مادر میں موجود بچے) کی مثال پیش کی جائے۔

جس طرح " عالمِ جنین " اور اس دنیا کے درمیان فاصلہ ہے اسی قدر اس دنیا اور دوسرے جہان کے درمیان ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

فرض کیجیے، عالمِ جنین میں رہنے والا بچہ اگر صاحب عقل و شعور ہوتا اور وہ ہماری اس دنیا کی تصویر کشی کرنا چاہتا تو دنیا میں موجود آسمان، زمین، آفتاب، ماہتاب، ستارے، جنگل، پہاڑ، دریا، سمندر غرضیکہ تمام کائنات کی تصویر کشی اس کے لیے کسی بھی طرح ممکن نہیں تھی۔

جو بچہ ابھی شکمِ مادر میں ہے اور شکم کے نہایت ہی محدود ماحول میں پرورش پا رہا ہے اسے کیا معلوم کہ

زمین کا زمردیں فرش کیا ہوتا ہے ؟

آسمان کا نیلگوں شامیانہ کسے کہتے ہیں ؟

آفتاب و ماہتاب کی قندیلیں کیسی ہوتی ہیں ؟

اس کی لغت میں تو مل جل کر کلُ چند کلمے بنتے ہیں۔ اور فرض کیجیے کہ اگر کوئی شخص باہر سے اس کے ساتھ بات کرے تو وہ اس کے ایک کلمے کو بھی نہیں سمجھ سکے گا۔

اس دنیا کا اور اس جہان کا باہمی فرق بھی بعینہٖ اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ ہم جس قدر بھی اگلی دنیا کے بارے میں معلومات حاصل کریں پھر بھی وہاں کی آسائشوں اور بہشت بریں کی نعمتوں سے کما حقہٗ باخبر نہیں ہو سکتے۔

یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے :

"فِيهَا مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا
أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى
قَلْبِ بَشَرٍ"

"بہشت میں ایسی ایسی نعمتیں ہوں گی جسے اب
تک نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا ہے نہ کسی کان نے
سُنا ہے اور نہ ہی کسی کے دماغ نے سوچا ہے"

اور قرآن مجید نے اسی مفہوم کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ
مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا
كَانُوا يَعْمَلُونَ"

"کوئی بھی شخص یہ نہیں جانتا کہ کیسی کیسی نعمتیں وہاں
پر ان کے لیے مخفی رکھی گئی ہیں جو ان کی آنکھوں کی
ٹھنڈک بنیں گی۔ یہ ان کے اعمال کی جزا
ہو گی جو وہ اس دنیا میں بجا لاتے ہیں۔"

(سورۂ سجدہ۔ آیت ۱۷)

اس جہان کی عدالت اور اس دنیا کی عدالتوں میں بھی زمین اور
آسمان کا فرق ہے۔ مثلاً بروز قیامت انسان کے اعمال کے گواہ اس کے اپنے
اعضاء بلکہ بدن کی کھال اور وہ زمین بھی ہو گی جہاں پر گناہ یا ثواب کے کام

انجام دیے گئے ہیں۔

خدا فرماتا ہے:

"اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ"

(سورہ یٰس آیت ۶۵)

"آج (قیامت) کے دن ہم ان (انسانوں) کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ اور پاؤں اپنے کیے کی گواہی دیں گے۔"

"وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ۭ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ"

"وہ لوگ اپنے بدن کی کھال سے کہیں گے کہ تو نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ تو وہ جواب دے گی جس خدا نے تمام مخلوق کو بولنے کی طاقت دی ہے اسی نے ہمیں بھی قوت گویائی عطا فرمائی ہے تاکہ حقائق کو بیان کریں۔" (سورۂ فصلت۔ آیت ۲۱)

البتہ ایک زمانے میں ایسے مسائل کا تصور بھی محال تھا لیکن آج کے

سائنسی دور نے یہ سب کچھ ممکن بنا دیا ہے۔ چنانچہ مختلف مناظر کی فلم بندی اور آواز کی ریکارڈنگ اس امر کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

اگرچہ ہم دُور سے اس جہان کی نعمتوں کا پرتو دیکھ رہے ہیں جن کی حقیقت سے کماحقہ، واقف نہیں ہو سکتے۔ اس کے باوجود یہ ضرور جانتے ہیں کہ وہاں کی نعمتیں اور سزائیں جسم اور رُوح کو باہم ملیں گی۔ کیونکہ معاد کا تعلق جسم اور روح دونوں سے ہے۔

اسی لیے خداوند عالم نے ان دونوں کو نعمتیں ملنے کا ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ جسمانی اور مادی نعمتوں کے بارے میں فرماتا ہے۔

"وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ... وَلَهُمْ فِيْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔"

(سورہ بقرہ۔ آیت ۲۵)

"(اے پیغمبرؐ!) جو لوگ ایمان لے آئے اور اعمال صالح انجام دیے ہیں انھیں اس بات کی خوشخبری سُنا دیجیے کہ ان کے لیے بہشت کے باغات ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی....

اور ان کے لیے پاک و پاکیزہ بیویاں ہوں گی،
اور وہ وہاں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔"

اسی طرح معنوی اور روحانی نعمتوں کے بارے میں فرماتا ہے :

"وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ"

(سورۂ توبہ۔ آیت ۷۲)

"خداوندِ عالم کی خوشنودی اور رضامندی جو
اہل بہشت کے شامل حال ہوگی وہ دوسری تمام
نعمتوں سے بڑھ کر ہوگی۔"

یقیناً جب بہشتی لوگ اس بات کا احساس کریں گے کہ خدا ان سے راضی ہے اور انھیں اپنی جنت میں حاضر ہونے کا شرف بخشا ہے تو وہ اپنے اندر اس قدر خوشی اور شادمانی کا احساس کریں گے جو بیان سے باہر ہے۔

اسی طرح جہنمیوں کے بارے میں ہے کہ انھیں جہنم کی آگ اور جسمانی شکنجوں کی سزا کے علاوہ خدا کی ناراضگی اور غیظ و غضب کی جو روحانی سزا ملے گی وہ جسمانی سزاؤں سے کئی گنا زیادہ ہوگی۔

اعمال کا مجسم ہونا

قابلِ غور بات یہ ہے کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن انسان کے اعمال زندہ ہو کر سامنے آجائیں گے اور مختلف صورتوں میں اس کے ساتھ رہیں گے۔

چنانچہ سزا اور جزا کا ایک اہم حصہ انسان کے اپنے اعمال ہوں گے۔

ظلم اور بیداد گری سیاہ اور تاریک بادلوں کی صورت میں انسان کو چاروں طرف سے گھیر لیں گے۔ جیسا کہ آنحضرت کا فرمان ہے:

"اَلظُّلْمُ ھُوَالظُّلُمَاتُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ"

"قیامت کے دن ظلم، سیاہی اور تاریکی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔"

اور قرآن مجید میں ہے:

"یتیموں کا نامشروع مال آگ کے شعلے کی صورت میں ظاہر ہوکر انسان کو اپنی لپیٹ میں لے گا۔"

(سورۂ نساء آیت ۱۰)

"اور ایمان نور اور روشنی کی صورت میں ہمارے چاروں اطراف کو گھیرے گا۔"

(سورۂ حدید۔ آیت ۱۲)

"سود خوار لوگ جو اجتماع کے اقتصادی توازن کو بگاڑ دیتے ہیں قیامت کے دن مرگی والے مریضوں کی طرح پیش ہوں گے جو پوری طرح اپنا توازن کھو چکے ہوں گے اور اٹھتے بیٹھتے وقت زمین پر جا گریں گے۔ (سورہ بقرہ۔ آیت ۲۷۵)

"جو مال ذخیرہ اندوز اور کنجوس لوگ اکٹھا کرتے ہیں اور اپنے اس مال سے غریبوں اور مسکینوں کے

حقوق ادا نہیں کرتے، قیامت کے دن ان کا وہی
مال طوق بنا کر ان کی گردن میں ڈال دیا جائے گا جس
کی وجہ سے وہ حرکت کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔"

(سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۸۰)

اسی طرح دوسرے اعمال ہیں جو مختلف صورتوں میں مجسم ہو جائیں گے۔
آج کی سائنسی تحقیقات بھی یہی کہتی ہے کہ دنیا کی کوئی
چیز ختم نہیں ہوتی۔ مادّہ اور انرجی ہمیشہ اپنی صورتیں تبدیل کرتے رہتے ہیں،
لیکن ختم نہیں ہوتے۔ ہمارے افعال و اعمال بھی اس سے خارج نہیں ہیں اس
قاعدے کے مطابق وہ باقی رہتے ہیں۔ ہر چند کہ ان کی صورتیں تبدیل ہوتی رہتی
ہیں ——— !

قرآن مجید نے قیامت کے بارے میں ایک مختصر سے جملے میں ہمیں
جھنجھوڑ کر فرمایا ہے:

"وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِراً"

"قیامت کے دن لوگ اپنے اعمال کو وہاں پر
موجود پائیں گے۔"

(سورۂ کہف آیت ۴۹)

انسان وہاں پر جو سزا یا جزا پائے گا درحقیقت اس کا اپنا کیا
دھرا ہوگا۔ چنانچہ اسی آیت کے ذیل میں خدا فرماتا ہے:

"وَمَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَداً"

"تمھارا خدا کسی پر بھی ظلم نہیں کرتا۔"

قیامت کے بارے میں خدا ایک اور جگہ فرماتا ہے :

"یَوْمَئِذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّیُرَوْا اَعْمَالَهُمْ"

"اس دن لوگ گروہ در گروہ محشور ہوں گے تاکہ انھیں ان کے اعمال دکھائے جائیں۔"

(سورۂ زلزال - آیت ۶)

"فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ۝ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ۔"

"جو ذرہ برابر نیکی کرے گا اسے وہاں پر دیکھ لے گا اور جو ذرّہ بھر بُرائی کرے گا وہ بھی اسے وہیں پر دیکھ لے گا۔"

(سورۂ زلزال - آیات ۷، ۸)

غور فرمائیے، کہا جا رہا ہے کہ خود اپنے اعمال کو دیکھ لے گا۔

جب انسان اس بات کی طرف متوجہ ہو جائے کہ ہمارے ہر قسم کے اعمال خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، نیک ہوں یا بد، اس دنیا میں محفوظ ہیں اور کبھی نہیں مٹ سکتے اور پھر قیامت کے دن ہر جگہ پر ہمارے ساتھ ہوں گے تو یقیناً وہ محتاط ہو جائے گا۔ برائیوں کے ارتکاب سے بچے گا اور نیکیوں کے انجام دینے میں کوشش کرے گا۔

بہرحال معاد اور قیامت کے بارے میں جو سوالات کیے جاتے ہیں، اور نیک لوگوں کے ہمیشہ بہشت میں اور بدکاروں کے ہمیشہ جہنم میں رہنے کے متعلق قرآن نے جو خبر دی ہے۔ "اعمال" کے مجسم ہونے" اور ہر نیک اور بد عمل کے روح میں مؤثر ہونے کو مدنظر رکھ کر ہر قسم کے سوالات کا جواب دیا جا سکتا ہے۔

؟ سوالات

۱ — آیا آخرت کی زندگی بھی ہر لحاظ سے اس دنیاوی زندگی کے مشابہ ہے ؟

۲ — آیا ہم اس دنیا میں جزا و سزائے آخرت کو درک کر سکتے ہیں ؟

۳ — آیا بہشت کی نعمتیں یا جہنم کا عذاب صرف جسم کو ملیں گے ؟

۴ — اعمال کس طرح مجسم ہو جاتے ہیں ؟ اور قرآن نے اس موضوع پر کیا دلائل پیش کیے ہیں ؟

۵ — اعمال کے مجسم ہو جانے پر اعتقاد رکھنا معاد کے بارے میں ہونے والے کن اعتراضات کا جواب دے سکتا ہے ؟

عصرِ حاضر کی خواتین کے لیے ڈاکٹر علی قائمی کی گرانقدر تصنیف

عاشورا اور خواتین

(واقعۂ کربلا میں خواتین کا کردار)

کربلا درحقیقت ایک باطل نظام اور فاسد معاشرے کے خلاف انقلاب تھا۔ اس انقلاب کی کامیابی اور پیش رفت میں خواتین کا کردار ایک مثالی حیثیت کا حامل رہا ہے۔ کتابِ ہذا میں خواتین کے اسی کردار کا تذکرہ اور ان خواتین کے کردار سے استفادہ کرتے ہوئے دورِ حاضر کی خواتین کو عصرِ حاضر کے نظامِ طاغوت اور فاسد معاشرے میں اسلام کی حقیقی تعلیمات کو رائج کرنے کا لائحۂ عمل دیا گیا ہے

خوبصورت طباعت   دیدہ زیب سرورق   عمدہ کاغذ   قیمت ۲۵ روپے

اتحادِ ملّتِ مسلمہ کی ایک سنجیدہ کوشش

علامہ محمد مہدی الآصفی کی گرانقدر تالیف

جس میں امامت کے مفہوم کو جدید علوم کی روشنی میں

سادہ وسلیس پیرائے میں بیان کیا گیا ھے

سیاست اور حکومت کے سلسلہ میں امام کے مقام کو واضح کیا گیا ہے مسئلہ امامت پر ملتِ اسلامیہ کے مختلف فرقوں کے مابین اختلاف کے اسباب بیان کیے گئے ہیں اور اسلامی فرقوں کو مفہوم امامت کے سلسلہ میں ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کی گئی ہے

آفسٹ طباعت

قیمت/۲۵ روپے

حسین شناسی

آیت اللہ محمد یزدی